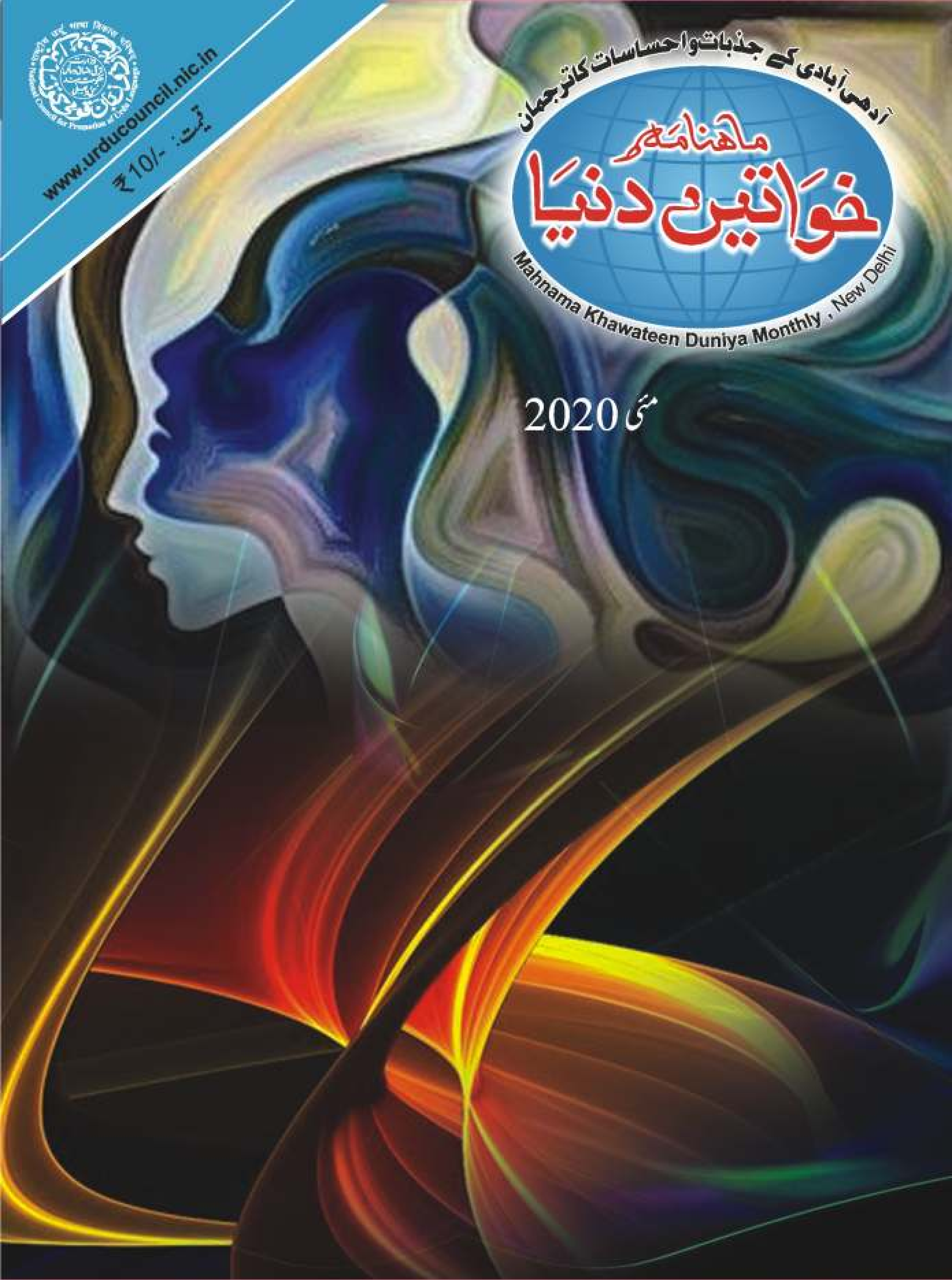

آدمی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

مئی 2020

www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10₹

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

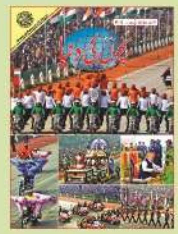

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ
خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد:4 شمارہ:5 مئی 2020

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقیِ انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون:49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	رشید جہاں کے افسانوں میں نسوانی مسائل	ڈاکٹر مسرت	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		9
جہان نسواں	جدید اردو افسانہ اور موضوعات	سید واصفہ غنی	10
	عہد حاضر میں کتب بینی کی صورت حال	ڈاکٹر روحی سلطان	14
	کہکشاں انجم کا افسانوی سفر	ڈاکٹر جاوید اختر	17
	عالم آرا بیگم کی شاعری	محمد شاہد	20
	طلبا اور ہم نصابی سرگرمیاں	روبینہ	24
	قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں ناسٹلجیا	عائشہ شفیق	28
	راگھویندر راؤ جذب عالپوری اور اردو ترجمہ	زلیخا بیگم چاند	32
	اکیسویں صدی میں اردو ناول میں عصری مسائل	امینہ فاروقی امام الدین	36
	اردو غزل کا مستقبل	استوتی اگروال	41
کہانیاں	پہلا قدم بہار کا	خیر النساء علیم	44
	آدھے دھڑ کے آدمی	زنیرہ ابرار	46
حسن سخن	صبیحہ سنبل		50
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		51
صحت	ہوائی امراض	محمد اکرم	53
آرائش وزیبائش	حسن کی نگہداشت		59
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		61

مشعل

کسی بھی قوم کی ترقی کا اندازہ اس قوم کے خواندہ افراد سے بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے۔ تعلیم کو اگر ہر فرد کے لیے عام اور ضروری کردیا جائے تو اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان کا ہر شہری خواہ دیہی علاقوں میں رہنے والا بھی اس سے فیض یاب ضرور ہوسکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ہماری پالیسی بھی واضح ہونی چاہیے۔

قوم کی ترقی کے لیے اور آنے والی نئی نسل کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ ہم انھیں تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں اور ان کے اندر علمی شعور بیدار کریں۔ ہمارے ملک میں ایسی بہت سی یونیورسٹیاں، اسکول اور کالجز ہیں جو نسل نو کو آنے والے وقت کے لیے مکمل طور پر تیار کرسکیں اور ان کے اندر علم کی شمع کو روشن کرسکیں۔

اگر موجودہ صورت حال کا جائزہ لیں تو بہت مایوسی ہوتی ہے۔ تعلیم سے متعلق بہت سے سروے کیے گئے ہیں۔ کچھ سروے حکومت کے ذریعے کرائے گئے ہیں اور کچھ عالمی اداروں کی زیر نگرانی بھی ہوئے ہیں۔ ان سروے سے یہی بات نکل کر سامنے آئی ہے کہ ہماری قوم کو جتنا فعال ہونا چاہیے اتنی وہ نہیں ہے۔ تعلیم کا فقدان انھیں ترقی کی راہ سے بہت دور لے جاتا ہے۔ اس تعلیمی پس ماندگی کی وجوہات کیا ہیں اس طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

دیہی علاقوں میں شہری علاقوں کی بہ نسبت بچے زیادہ تعداد میں ناخواندہ رہ جاتے ہیں۔ اس کے پیچھے کئی وجوہات کارفرما ہوتی ہیں۔ پرائمری اور ہائر سیکنڈری کی سطح پر بھی بچوں کے اندر تعلیمی بیداری نہیں آپاتی۔

خواتین کی اگر بات کی جائے تو مسلم خواتین میں دوسرے مذاہب کی خواتین کی بہ نسبت خواتین کی شرح خواندگی بہت کم ہے۔ اس جائزے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قوم کی شرح خواندگی کے ساتھ ساتھ ملک کی خواتین بھی تعلیم کے میدان میں بہت پس ماندہ ہیں۔ خواتین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کسی بھی قوم کی ترقی اور تنزلی کا دارومدار عورت پر ہوتا ہے۔ بچے کے لیے پہلی درسگاہ اور پہلا مکتب بھی عورت کی گود ہی قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب خواتین خود ہی پڑھی لکھی اور باشعور نہیں ہوں گی تو وہ اپنے بچوں کو کیا درس دے سکیں گی۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ ہم زندگی کے دوسرے میدانوں مثلاً معیشت، سرکاری وغیر سرکاری ملازمت، سیاست غرض ہر میدان میں بہت پس ماندہ ہیں۔ جب تعلیم سے ہی ہمارا کوئی سروکار نہیں ہوگا تو دیگر میدانوں میں ہم اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کس طرح کرسکتے ہیں۔ یہ صورت حال کافی تشویش ناک اور حیران کن ہے۔ ہمیں اس طرف بھی توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔

ہمیں چاہیے کہ ہم اس پس ماندگی کو دور کرنے کے لیے ہر عملی اقدام کریں۔ صرف حکومت کو اس بات کے لیے ذمہ دار ماننا صحیح نہیں ہے۔ ہمیں عملی اقدام کرتے ہوئے ہونہار طالب علموں کی نشاندہی کرنی چاہیے اور حکومت کی اس طرف توجہ مبذول کرائی جانی چاہیے کہ وہ ملکی اور عالمی سطح پر نوجوانوں کو روزگار کے مواقع فراہم کرائے تاکہ ان کے مستقبل کے لیے یہ روزگار معاون ثابت ہوسکیں۔

ہمیں وقت وقت پر حکومت کی اسکیموں سے واقفیت حاصل کرتے رہنا چاہیے۔ تعلیم کے میدان میں حکومت نے بہت سے عملی اقدام کیے ہیں۔ ناواقفیت کی وجہ سے ایک خاص طبقہ ان تمام اسکیمات سے محروم ہوجاتا ہے۔ اس ضمن میں بھی ہمیں توجہ دینے کی اشد ضرور ہے۔ حکومت کے ساتھ ساتھ ملک کی بہت سی ایسی تنظیمیں بھی ہیں جو تعلیم کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کو روزگار بھی مہیا کراتی ہیں تاکہ ملک کے نوجوانوں کا مستقبل تابناک بن سکے۔

تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنے کے لیے اور روزگار کے امکانات پیدا کرنے کے لیے بھی تربیتی کیمپوں کا انعقاد کیا جاتا ہے تاکہ ان کے ذریعے لوگوں میں آگہی پیدا ہوسکے اور وقتاً فوقتاً ان کو تعلیم اور روزگار کی اسکیمات کے بارے میں معلومات مہیا کرائی جاسکے۔ خواتین کو اپنے تئیں بیدار ہونے کی اشد ضرورت ہے۔ انھیں اپنے لیے ایسے راستوں کا انتخاب کرنا ہوگا جو ان کے لیے کارآمد اور مفید ہوں اور آنے والی نسلوں کے لیے وہ مثال قائم کرسکیں۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر مسرت

رشید جہاں

کے افسانوں میں نسوانی مسائل

ہندوستان کی تہذیبی اور معاشرتی تاریخ میں خواتین کی صورتحال کو بہت کمتر کرکے پیش کیا گیا ہے۔ اس صورتحال کو ہم مرداساس معاشرے کی سوچ اور اس کی منفی فکر کا نتیجہ قرار دے سکتے ہیں۔ دنیا کے ہر بڑے ملک میں عورت کی یہی صورتحال سامنے آتی ہے۔ عورت کو مختلف مذاہب میں عزت اور قدر و منزلت عطا کی گئی ہے لیکن اس سوچ کا کیا کیجیے جسے مرد اساس معاشرہ نے اپنے ذہن میں جگہ دے رکھی ہے۔

فرسودہ رسم و رواج اور بے جا سماجی پابندیوں کی رشید جہاں سخت خلاف تھیں۔ انھوں نے خواتین کی روایت پرستی کو توڑا اور اپنے لیے الگ راہوں کا انتخاب کیا۔ انھوں نے عورتوں کے مسائل کی طرف اپنے ذہن کو مائل کیا اور عورتوں کی زبوں حالی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ انھوں نے بہت بے باکی سے خواتین کی زندگی میں رونما ہونے والے حادثوں کا بیان کیا۔ ان کے افسانوں میں اس عہد کے مسائل کو دیکھا جا سکتا ہے جو اس وقت خواتین سے متعلق تھے اور کسی نہ کسی صورت میں آج بھی موجود ہیں۔

رشید جہاں کا سیاسی اور سماجی شعور بہت بیدار تھا۔ ان کی سوچ کافی وسیع تھی۔ وہ مردانہ سماج کی ان زیادتیوں کے سخت خلاف تھیں جن کی وجہ سے عورت کو مظلومیت کا سامنا کرنا پڑا۔ رشید جہاں کے افسانوں میں عورت کا جو کردار ابھرتا ہے وہ بہت واضح اور نمایاں ہے۔ ان کے افسانوں میں بظاہر تو ایسی کوئی قابل اعتراض بات نظر نہیں آتی لیکن پھر بھی وہ اپنے افسانوں کی وجہ سے اس وقت کے سماجی ٹھیکے داروں اور مولویوں کے طنز کا نشانہ بنیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر علی جاوید کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"عورت کی آزادیوں اور جذبوں کو مسخ کرنے والی اخلاقی تعلیمات کے خلاف پہلی مرتبہ کسی خاتون افسانہ نگار نے ایسے کردار پیش کیے تھے جو طبقاتی کشمکش کی عکاسی کرتے ہیں جو صبر قناعت اور ایثار کے سبق کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔ ان کی عورت ذہنی طور پر بیدار ہے کہ اس کے حقوق کی بحالی عام سماجی مسائل سے الگ نہیں بلکہ پورے سیاسی اور سماجی نظام سے جڑی ہوئی ہے۔ اور اس کی نجات ان مردوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر جدوجہد کرنے میں ہے، جس کی بنیاد معاشی سطح پر استحصال کرنے والے ڈھانچے پر ہے۔ اس لیے وہ اس نظام کو تبدیل کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔"

(رشید جہاں ایک ریڈیکل آواز، مشمولہ: بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب، 2002، ص:253)

رشید جہاں کی پیدائش 25/اگست 1905 کو لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام شیخ عبداللہ تھا جو کشمیر کے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیڈی ہارڈنگ اسکول سے انھوں نے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی۔ ایم بی بی ایس کرنے کے بعد بھی انھوں نے علم و ادب سے اپنا رشتہ

جوڑے رکھا۔ 1931 میں ان کی ملاقات محمود الظفر اور سجاد ظہیر سے ہوئی۔ یہ لوگ ترقی پسند تھے۔ اس دور میں جب کہ عورت کا گھر سے نکلنا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا رشید جہاں نے اس دور میں بھی کسی قسم کی پابندی کو اپنے لیے جائز نہیں سمجھا۔

رشید جہاں محمود الظفر سے بہت متاثر تھیں۔ 1934 میں انھوں نے محمود الظفر سے شادی کر لی۔ 1932 میں انگارے کی اشاعت عمل میں آئی۔

مردانہ سماج میں عورتوں پر ہو رہے ظلم و جبر، استحصال اور عورتوں کی آزادی، ان کی بے چارگی کا رشید جہاں کو بخوبی اندازہ تھا۔ ان کے افسانوں میں عورت کے کئی روپ سامنے آتے ہیں۔ رشید جہاں ہی ایک ایسی واحد خاتون تھیں جنھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے عورت کی سوئی ہوئی خود اعتمادی کو جگانے میں اہم رول ادا کیا۔ وہ اس قدر بے باک اور نڈر تھیں کہ انھوں نے معاشرے کی کوئی پرواہ نہیں کی اور عورتوں کی مظلومیت کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ رشید جہاں ہی وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے عورتوں کی خستہ حالی، ازدواجی رشتوں میں ٹوٹ پھوٹ، مسلم عورتوں کی گھٹن کو اپنے افسانوں میں اجاگر کیا۔ یہ تمام موضوعات تانیثیت سے متعلق ہیں جو ان کے افسانوں میں واضح ہوئے ہیں۔ رشید جہاں کو آزادیٔ نسواں کی پہلی علم بردار خاتون کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ کسی کی پرواہ کیے بغیر انھوں نے عورت کے خلاف ظلم و جبر کو پیش کیا اور مردانہ سماج کو للکارا۔ شبنم آرا رشید جہاں کے متعلق لکھتی ہیں:

''تانیثیت کے مباحث ابتدائی نقوش سب سے پہلے اور باضابطہ جس خاتون کے یہاں نظر آتے ہیں وہ معتبر اور مستند نام ڈاکٹر رشید جہاں کا ہے۔ جنھوں نے تمام فرسودہ اور جابرانہ طرز حکومت کی حد بندی کو توڑ ڈالا اور روایت سے بغاوت کی اور عالمگیر نظریات کو سمجھتے ہوئے ہمہ گیر مسائل کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر رشید جہاں کی پرورش و تربیت، خالصاً تعلیم و تحریک نسواں کے ماحول میں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر رشید جہاں اپنی ذات سے نہایت ہی ذہین، ترقی پسند اور روشن خیال تھیں۔ انھوں نے اسکول کے دنوں سے ہی سماج میں عورتوں کی مظلومیت اور کربناک زندگی کے خلاف لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ''انگارے'' کی اشاعت اور اس میں اس کی شمولیت، ان کی بے باکی اور بہادری کی اعلیٰ مثال تھی۔ انھوں نے تخلیقی سطح پر افسانے، ڈرامے اور مضامین لکھے اور پہلی بار اپنے افسانوں میں مردانہ بالادستی کی ذہنیت اور عورتوں کے مذہبی، اقتصادی استحصال کے خلاف خوب لکھا اور جم کر لکھا۔''

(شبنم آرا، تانیثیت کے مباحث اور اردو ناول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2008، ص:124)

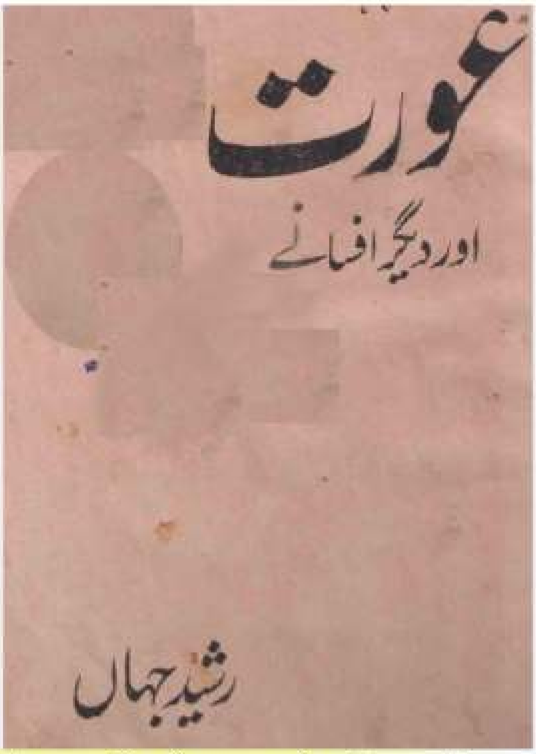

رشید جہاں نے سماج کی روایتوں سے انحراف کیا اور اپنے لیے الگ راہیں نکالیں۔ ان کے سوچنے کا جو انداز تھا وہ انقلابی تھا۔ ان کا افسانہ 'دلی کی سیر' ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس میں عورت کو محض ایک شئے تصور کیا جاتا ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ دلی کی سیر ملکہ بیگم کی کہانی ہے جو کہ فرید آباد میں رہتے ہوئے اپنے شوہر سے دلی کی سیر کی فرمائش کر بیٹھتی ہے۔ شوہر اس کو دلی کی سیر کرانے کے لیے ٹرین کا سفر کرتا ہے اور اس کو دلی لے آتا ہے۔ اسٹیشن پر ایک کونے میں ملکہ بیگم کو بیٹھا کر شوہر خود غائب ہو جاتا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''یہاں سے ریل میں بیٹھ کر دلی پہنچی اور وہاں ان کے ملنے والے کوئی نگوڑے اسٹیشن ماسٹر مل گئے۔ مجھے اسباب پاس چھوڑ کر رفو چکر ہوئے اور میں اسباب پر چڑھی برقع میں لپٹی بیٹھی رہی۔ ایک تو کم بخت برقعہ دوسرے مردوے مرد تو ویسے ہی

خراب ہوتے ہیں اور اگر کسی عورت کو اس طرح بیٹھے دیکھ لیں اور چکر پہ چکر لگاتے ہیں۔ پان کھانے تک کی نوبت نہیں آتی۔ کوئی کھانسے، کوئی آوازے کسے اور میرا ڈر کے مارے دم نکل جائے اور بھوک وہ غضب کی لگی ہوئی کہ خدا کی پناہ!........کوئی دو گھنٹے بعد مونچھوں پر تاؤ دیتے دکھائی دیے اور کس لاپرواہی سے کہتے ہیں کہ بھوک لگی ہو تو پوڑیاں ووڑیاں کھاؤ گی میں تو ادھر ہوٹل میں کھا آیا۔''

(دلی کی سیر، مشمولہ: بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب، مرتبہ: ترنم ریاض، ساہتیہ اکادمی، 2004، ص: 97-96)

مذکورہ بالا اقتباس میں رشید جہاں نے مرد کی بالادستی اور بے حسی کو ظاہر کیا ہے۔ ملکہ بیگم اسٹیشن پر جن اذیت ناک لمحوں سے گزر رہی تھی وہ توجہ طلب ہے۔ اسٹیشن پر لوگوں کے ہجوم اور لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی ایک عورت اپنے آپ کو بالکل تنہا مجبور اور لاچار تصور کرتی ہے۔ اس منظر میں افسانہ نگار نے عورت کی بے بسی کو ظاہر کیا ہے۔ مردوں کا ملکہ بیگم کے اردگرد چکر لگانا، آوازیں کسنا، جملے بازی کرنا یہ تمام صورتحال آج بھی کہیں نہ کہیں دیکھنے کو مل ہی جاتی ہے۔ 'دلی کی سیر' میں بظاہر تو کوئی خاص بات نظر نہیں آتی لیکن رشید جہاں نے بڑی جرأت مندی سے مسلم معاشرے کی خاتون کے مسائل پر پہلی بار قلم اٹھایا اور شاید یہی وجہ تھی کہ ان کو عتاب کا شکار ہونا پڑا۔ انھوں نے صرف پردے کو ہی موضوع نہیں بنایا بلکہ عورت کے ان تمام مسائل کو نشان زد کرنے کی کوشش کی ہے جو عورت کو پیش آسکتے تھے یا آرہے تھے۔

رشید جہاں کے افسانوں سے خواتین بہت متاثر ہوئیں۔ 'انگارے' کی اشاعت سے رشید جہاں کی شہرت میں بھی اضافہ ہوا۔ ان کی تخلیقات میں مرد اساس معاشرے کے تئیں غم وغصہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ تمام مسائل کو طبقاتی کشمکش کے آئینے میں دیکھتی ہیں۔ ان کا ایک اور افسانہ 'افطاری' ہے۔ یہ ایک غریب آدمی کی کہانی ہے جو غربت میں روزہ رکھتا ہے لیکن وہ افطاری کا انتظام نہیں کرسکتا۔ 'افطاری' نام کی کہانی گھر کی نوکرانی کی نفسیات کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کہانی میں ایک عورت اور بچے کا کردار بھی سامنے آتا ہے۔ ماں بچے کو جنت کے بارے میں بتاتی ہے:

''جنت یہ ہے جہاں ہم اور تم اور چچا اور خالہ جان رہتے ہیں۔ بڑا سا گھر، صاف ستھرا، کھانے کو مزے مزے کی چیزیں، مکھن، توس، پھل، انڈا، سالن، دودھ، سب کچھ ہوتا ہے۔ بچوں کے پاس اچھے کپڑوں اور کھیلنے کو اچھی سی موٹر ہوتی ہے۔''

''تو اماں سب لوگ جنت میں کیوں نہیں رہتے۔''

اس لیے میری جان کہ جو لوگ جنت میں رہتے ہیں وہ ان لوگوں کو گھسنے نہیں دیتے۔ اپنا کام تو کروا لیتے ہیں اور ان کو پھر دوزخ میں دھکا دے دیتے ہیں۔''

(مشمولہ: بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب، 2002، ص:255)

سماجی مسائل ان کی دیگر کہانیوں میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ 'انگارے' میں شامل ان کا ایک ڈرامہ ''پردے کے پیچھے'' بھی ہے۔ اس ڈرامے میں متوسط مسلمان طبقے کی ذہنیت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مرد عورت کو محض جنسی شئے سمجھ کر اس کے ساتھ ہر قسم کا سلوک کرتا ہے۔ عورت مرد کو جنسی تسکین کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ مرد کے حواس پر ہر لحہ عورت چھائی رہتی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے جو 'پردے کے پیچھے' سے ماخوذ ہے:

''کتنی مصر ہوئی کہ میں خود دودھ پلاؤں گی لیکن سنتا کون ہے۔ دھمکی یہ کہ دودھ پلاؤں گی تو میں اور بیاہ کرلوں گا۔ مجھے ہر وقت عورت چاہئے میں اتنا صبر نہیں کرسکتا کہ تم بچوں کی ٹلے نویسی کرو اور پھر تم کہتی ہو.......یہاں تو مردہ جنت میں

جائے یا دوزخ میں اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ بیوی نگوڑی چاہے اچھی ہو چاہے مر رہی ہو۔ مردوں کو اپنے نفس سے کام ہے۔ وہ بچاری سن کر چپ ہو گئی۔ کہنے لگی کہ آپ اتنی بیمار ہیں اور بوا وہ بچاری کیا سب ہی ڈاکٹر یہ کہتے ہیں کہ آپ کے بچے کس طرح موٹے تندرست ہوں۔ جب ایک تو آپ خود ہی اتنی کمزور دوسرے بچے اتنی جلدی جلدی ہوتے ہیں کیا کیا جائے۔''

(مشمولہ، اردو ادب میں تانیثیت، مشتاق احمد وانی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2013، ص:604)

مذکورہ اقتباس میں رشید جہاں نے مردوں کی فطرت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مرد اساس معاشرے میں عورت کی کیا حیثیت ہے اس کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی ہوتا ہے۔

ان کی ایک اور کہانی ''سودا'' ملاحظہ کیجیے جس میں چار دوست تفریح کے لیے جاتے ہیں۔ اس کہانی میں تین نسوانی کردار ہیں اور ایک مرد کردار۔ مرد کا کردار کچھ بے ضرر سا ہے۔ کہانی کی ہیروئن فلیش بیک میں چلی جاتی ہے اور اپنے چاہنے والے کو یاد کرتی ہے۔ کہانی کے پہلے حصے میں عشق و محبت کے متعلق خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ دوسری طرف معاشرے کی اس صورتحال کو بھی پیش کیا گیا ہے جہاں مرد اور عورت کے تعلق کا مطلب صرف جنسی رشتے تک محدود ہے۔ اس کی عکاسی اس کہانی میں کچھ اس انداز سے کی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''بازار میں جب ایک کتیا کے پیچھے تین چار کتے پڑتے ہیں اور اسی طرح جوش اور بیباکی دکھاتے ہیں تو کمبخت کتیا بھی اتنے خریداروں کا ہجوم دیکھ کر جان چھپا کر بھاگتی ہے۔ یہ انسانی عورت جس کو مالداروں اور نیک شریف عورتوں نے کتیا سے بھی نیچا کر دیا تھا۔ ایک ہاتھ سے کار پکڑ کر جھولتی رہی۔'' جانی تم ہی بتاؤ کہ تمھارے ساتھ پہلے کون چلے؟..... وہ زور سے ہنسی.........ارے آجاؤ، میرے لیے تم سب حرامی ایک ہی ہو۔'' (ایضاً، ص:606)

مذکورہ افسانے کے ذریعے رشید جہاں نے مرد اساس معاشرے پر ایسی کاری ضرب لگائی ہے کہ اس سے پہلے کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک خاتون تخلیق کار اور وہ بھی ایک مسلم خاتون جنسی مسائل کے بیان میں اس حد تک بے باک ہو سکتی ہے یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔ یہ پہلا قدم تھا جو رشید جہاں نے عورتوں کی حمایت میں اٹھایا۔

رشید جہاں کے افسانوں کا تجزیہ تانیثی نقطۂ نظر سے کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے افسانوں کے ذریعے عورت کی کھوئی ہوئی خود شناسی کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں۔ وہ بالکل ایک نئے ماحول کی عورت کو ہمارے سامنے پیش کرنا چاہتی ہیں جہاں اس پر کسی قسم کی بے جا پابندی یا روک ٹوک نہیں ہو۔ وہ آزاد اور خود مختار ہو کر اپنی زندگی بسر کر سکے۔ مردوں کی اس بالادستی کو انھوں نے بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے وہ عورت کو محض سامان عیش سمجھتا ہے۔ وہ ان تمام سماجی برائیوں پر بھی کاری ضرب لگاتی ہیں جہاں عورت کو ہمیشہ محکوم و مجبور تصور کیا جاتا ہے۔

رشید جہاں سماج کی اصلاح چاہتی تھیں۔ وہ عورت کو با اختیار بنانے کے حق میں تھیں، ان کے اندر کھوئی ہوئی خود اعتمادی پیدا کرنا چاہتی تھیں، ان کی آزادی چاہتی تھیں۔ ان کا ایک مقصد حیات تھا اور زندگی کو جینے کا اپنا ایک الگ انداز۔ انھوں نے معاشرے کی وہ تمام الجھنیں جو بالخصوص عورتوں سے متعلق تھیں، کو سمجھنے کی کوشش کی اور معاشرے کی سچائیوں کو بے نقاب کرنے میں کامیاب بھی ہوئیں۔

Dr. Musarrat

musarrat.parveen5@gmail.com

شاعرات کے منتخب اشعار

اپنا ہر انداز آنکھوں کو ترو تازہ لگا
کتنے دن کے بعد مجھ کو آئینہ اچھا لگا

میں تو اپنے آپ کو اس دن بہت اچھی لگی
وہ جو تھک کر دیر سے آیا، اسے کیسا لگا

زہرا نگاہ

ہے نا تمام ابھی داستانِ سوز دروں
کہ ایک عمر یہ داغِ نہاں سلگتے ہیں

گماں تھا نور کا جس پر وہ نار ہے شاید
شرر فشاں ہے نفس جسم و جاں سلگتے ہیں

زاہدہ زیدی

ہر سانس انتظار ہے ہر گام اضطراب
شاید بلا رہی ہے تری رہ گزر مجھے

یہ کڑا سفر گزرتا یہ شب دراز کٹتی
کوئی حرف وعدہ ہوتا کہ سحر کو شام کرتے

ساجدہ زیدی

اس ایک لمحے کو میں لا زوال سمجھوں گی
ترے وصال کا موسم اگر کبھی دیکھا

موج میں آ کے کبھی خود جو سنورنا چاہا
آبگینوں کو عیاں آئینہ کرنا چاہا

رشیدہ عیاں

یہ وہ قافلے ہیں ہمدم کہ نہ پوچھ جن سے منزل
نہ بتا سکیں گے یہ بھی کہ چلے تھے یہ کہاں سے

جو دیے بجھا کے اپنے تری انجمن میں آئے
وہ چراغ لے کے ڈھونڈیں کہ کہاں پہ روشنی ہے

وحیدہ نسیم

فکر تعمیر نشیمن میں ہے بلبل پھر بھی
دامِ صیاد بھی ہے برق شرر بار بھی ہے

منحصر حوصلۂ دل پہ ہے ثابت قدمی
جادۂ شوق یہاں سہل بھی دشوار بھی ہے

سیدہ فرحت

اک نظر نے زندگی کے سارے کانٹے چن لیے
گل بد اماں کر دیا ہے عشق خوش انجام نے

تیری یادوں کے دیے جب بھی جلاتا ہے یہ دل
حسن کچھ اور شبِ غم کا نکھر جاتا ہے

ممتاز مرزا

وہ صبح آئے کہ پھر جس کی کوئی شام نہ ہو
جو میرا خواب ترے خواب سے بدل جائے

تم ہو اک خواب تو اس خواب کی تعبیر ہوں میں
میں اگر روٹھ بھی جاؤں تو منا لو مجھ کو

جمیلہ بانو

سیدہ واصفہ غنی

جدید اردو افسانہ

ہیئت اور موضوعات

جدیدیت کے رجحان کے تحت جو افسانے لکھے گئے وہ نہ صرف موضوع کے اعتبار سے ترقی پسند یا روایتی افسانہ سے الگ تھے بلکہ انداز پیش کش کے اعتبار سے بھی جدا تھے اور یہ دونوں چیزیں مل کر ہی اسے جدید بناتی ہیں۔ علامتی اور تجریدی انداز تحریر جدید افسانہ نگاروں کی پیشکش کا اہم ذریعہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خصوصاً علامتی اور تجریدی افسانے جدیدیت کی پہچان سمجھے گئے اور یہ علامتیں اتنی سہل بھی نہ تھیں کہ فوراً معنی کی تہہ تک پہنچ کر اندازہ لگا لیا جائے اور کسی ایک معنی کے حق میں فیصلہ سنا دیا کہ یہاں افسانہ نگار کا یہ اشارہ ہے۔ یہ علامتیں اپنے اندر ایک سے زائد معنی کی گنجائش رکھتی تھیں جس پر قاری کا ذہن دیر تک سوچتا رہے اور دوبارہ جب اس کہانی کو پڑھا جائے تو اسے اپنے خیالات میں ترمیم کرنی پڑے کیونکہ کہانی تب ایک نئے روپ میں واضح ہوتی ہے۔ جدید افسانے کی یہ خوبصورتی ہے کہ آپ اس کی قرات کے فوراً بعد کوئی فیصلہ صادر نہیں کر سکتے۔

اس منفرد انداز تحریر سے قلمکار اس قدر متاثر تھے کہ اردو میں علامتی اسلوب کی بہتات ہوگئی یہاں تک کہ جدید اردو افسانے کا نام سنتے ہی علامتی اور تجریدی افسانے کا عکس ذہن میں جھلملانے لگتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ انھیں جدیدیت کا مترادف ہرگز نہیں سمجھا جا سکتا۔ ایسے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو جدید افسانے کو روایتی افسانے سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ کون سی لکیر ہے جو روایتی افسانے اور جدید افسانے کے بیچ میں کھینچی جا سکتی ہے۔ ان سوالوں کے جوابات چند جملوں میں ممکن نہیں ہیں۔ نہ ہی ہمارے پاس کوئی واضح آبجکٹ ہے جس کی جانب اشارہ کر سکیں اس لیے ہمیں چند قدم پیچھے جا کر دیکھنے کی ضرورت ہے کہ روایتی افسانہ کیا تھا۔

وقار عظیم مختصر افسانے کی تعریف وضع کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ”مختصر افسانہ ایک ایسی مختصر فکری داستان ہے جس میں کسی ایک خاص واقعہ، کسی ایک خاص کردار پر روشنی ڈالی گئی ہو اس میں پلاٹ ہو اور اس پلاٹ کے واقعات کی تفصیلیں اس طرح گتھی ہوئی اور اس کا بیان اس قدر منظم ہو کہ وہ ایک واحد تاثر پیدا کر سکے“

(فن افسانہ نگاری، (ترمیم شدہ ایڈیشن)، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، صفحہ 31-30)

اس طرح روایتی افسانے میں پلاٹ سازی، کردار نگاری، وحدت تاثر وغیرہ مختصر افسانے کے اہم ستون قرار پائے۔ جنھیں اجزائے ترکیبی کہا گیا۔ روایتی افسانے کے وجود کے لیے ان اجزائے ترکیبی کو پتھر کی لکیر کا درجہ حاصل تھا۔ جن کی خلاف ورزی کا تصور ممکن ہی نہیں تھا جبکہ جدید افسانہ اس فہرست سازی کو خاطر میں ہی نہیں لایا اور اپنی راہیں افسانہ نگاروں نے خود متعین کیں۔ روایت پسند افسانہ نگاروں میں تقریباً سبھی کا اس بات پر اجماع تھا کہ بغیر پلاٹ کے افسانہ کا وجود ہی نہیں اور غیر مربوط پلاٹ کا افسانہ فنی اعتبار سے ناقص ہے۔ یوں پلاٹ کو افسانے میں وہی حیثیت حاصل تھی جو انسانی جسم میں ریڑھ کی ہڈی کو۔۔۔

جبکہ جدیدیت کے رجحان کے تحت بغیر پلاٹ کے افسانہ لکھنے کا رواج عام ہوا۔ حالانکہ یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ پہلے پہل کرشن چندر جیسے افسانہ نگار نے دو فرلانگ لمبی سڑک جیسا پلاٹ لیس افسانہ لکھ کر افسانے کی ہیئت میں تجربہ کیا تھا اور احمد علی نے بھی 'ہماری گلی' لکھ کر جیسا پلاٹ لیس افسانہ اردو ادب کو دیا تھا۔

لیکن جدید افسانہ نگاروں کے یہاں بغیر پلاٹ کے افسانہ نگاری کا چلن بادِ مخالف کی طرح زور پکڑتا گیا۔ بغیر پلاٹ کے افسانے کے متعلق جمیل اختر محبی لکھتے ہیں:

> ''جب نئے افسانے کا دور شروع ہوا تو پلاٹ کے متعلق نظریات میں نمایاں تبدیلی ہوئی اس کی اہمیت آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی۔
>
> یہاں تک کہ بغیر پلاٹ کے افسانے لکھے جانے اور اس کے لیے یہ تاویل پیش کی گئی کہ ہماری زندگی پلاٹلیس ہے اس میں کوئی ہموار پلاٹ نہیں۔ اور چونکہ افسانے میں زندگی کی تعبیر وتشریح ہوتی ہے۔ لہٰذا حقیقت نگاری کو گرفت میں لینا ہے تو پھر اسے آزاد کرنا چاہیے''

(فلسفہ وجودیت اور جدید اردو افسانہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، سنہ اشاعت 2002، صفحہ 126)

افسانوں میں کردار نگاری کا pattern بھی تبدیل ہو گیا، کرداروں کے ظاہری حلیے کو پیش کرنے کا تصور ہی ختم ہو گیا۔ یہاں تک کہ ان کے نام کی جگہ اشارے استعمال کیے جانے لگے۔ اب افسانے کے کردار گھیسو، مادھو، ہوری کی جگہ یہ، وہ، لڑکا، لڑکی، بوڑھا بڑھیا یہاں تک کہ الف، ب، ج استعمال ہونے لگے۔ جن سے کہانی پڑھتے ہوئے مانوس ہونے میں وقت لگ جائے۔ یوں جدید افسانے کے کردار غیر واضح اور مبہم نظر آتے ہیں۔

ایک اہم چیز جو مختصر افسانے کا خاصہ ہے وہ تھا وحدت تاثر۔ جدید افسانے کی لہر میں وحدت تاثر پر بھی کاری ضرب لگائی ہے۔ ظاہر ہے منتشر ذہن سے نکلنے والے افکار وخیالات میں بھی انتشار ہوگا۔ ایسے میں ایک ہی تاثر قائم کرنے کا سوال ہی نہیں۔ دوسری 'طرف شعور کی رو' کے تحت لکھے گئے افسانے میں خیالات کی یلغار پائی گئی۔ یہاں بھی جدید افسانہ روایتی افسانے کی حد بندیوں کو توڑتا ہوا نظر آیا۔

کہانی پن کسی بھی افسانے کا بنیادی عنصر ہوتا ہے۔ افسانے میں کسی کہانی کا بیان ہی ہوتا ہے۔ لیکن جدید افسانے کی لہر میں جو چیز غائب ہوتی گئی ہو وہ افسانے سے کہانی پن کا خاتمہ تھا۔

طارق چھتاری اپنے مضمون جدید افسانے کا فن میں لکھتے ہیں:

> ''افسانے کا فن بنیادی طور پر کہانی کہنے کا فن ہے۔ اگر کسی افسانے میں کہانی پن نہیں ہے تو وہ افسانہ مضمون انشائیہ یا محض نثر کا ایک ٹکڑا ہی معلوم ہوگا۔ 1960 کے بعد اردو میں ایسی کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں جن میں کہانی پن کا فقدان ہے۔ یا ان کا عدم وجود برابر نظر آتا ہے''۔

(جدید افسانہ اردو ہندی، ایجوکیشنل بک ہاؤس ایڈیشن 1992 صفحہ 74)

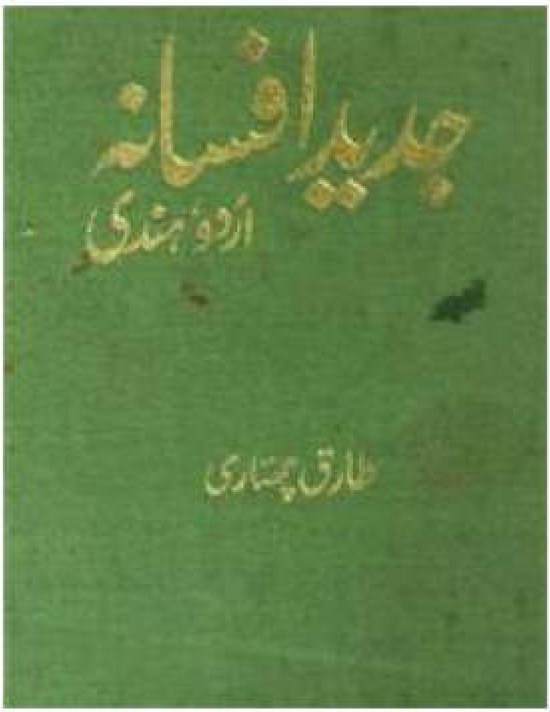

یوں تو ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کی تحریک کے بیچ کوئی حد قائم نہیں ہے اور کوئی ادبی تحریک کوئی حادثہ نہیں ہے کہ اچانک واقع ہو جائے۔ بلکہ سماج میں پے در پے ہونے والی تبدیلیاں ان تحریکات کے لیے حالات سازگار کرتی ہیں پھر نا معلوم طریقے سے کہیں کوئی کونپل پھوٹتی ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ یہ تحریک نشو ونما پاتی ہے۔ ملک کی آزادی کے ساتھ تقسیم و فسادات کا واقعہ، خاتمہ، زمینداری، بڑی سطح پر قائم ہوتے کارخانے، شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی، فلیٹ سسٹم کا رائج ہونا، مساوات مرد وزن کا تصور، ساتھ ہی ساتھ عالمی سطح پر ہونے والے کئی اہم واقعات، عالمی جنگیں اور ان کے اثرات غرض کئی محرکات تھے جن کی وجہ سے زمینی اور ذہنی سطح پر جدیدیت کا آغاز ہوا۔

جدید افسانہ صرف تکنیکی تجربات یا اسلوب کے لحاظ سے ترقی پسند یا روایتی افسانے سے مختلف نہیں ہے۔ بلکہ مسائل و موضاعات کے اعتبار سے بھی روایتی افسانے سے الگ ہے۔ ترقی پسند افسانے کے موضوعات پر دیہی زندگی اور اس کے مسائل کا غلبہ تھا۔ جبکہ جدید اردو افسانے کا محور شہری زندگی اور اس کے مسائل ہیں۔ جدید افسانے میں گاؤں کی زندگی اور اس کے مسائل پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ خصوصاً ابتدائی دور میں سریندر پرکاش کے ''بجوکا'' کے علاوہ کوئی خاص نام ذہن میں نہیں آتا۔ 70 کی نسل کے افسانہ نگاروں میں طارق چھتاری نے کچھ افسانے دیہاتی زندگی پر ضرور لکھے ہیں جن میں 'چھلاوہ' اور وہ، آن بان اور لکیر، 'صبح کا ذب' اور 'دس بیگھے کھیت' جیسے افسانے ہیں۔ سریند پرکاش سے لے کر طارق چھتاری تک جدید افسانہ نگاروں کی لمبی فہرست موجود ہے۔ مگر دیہاتی زندگی کی پیشکش میں ان کے یہاں گہری خاموشی ہے بیچ میں یقیناً کچھ ایسے نام ہیں جو گنوائے جا سکتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جدید افسانے میں ان افسانوں کی پہچان گمشدہ ہی رہی ہے۔

جدیدیت کے عروج کے زمانے میں یقیناً کچھ ایسے اسباب تھے جنھوں نے شہری زندگی اور اس کے مسائل کو پیش کرنے کے لیے ادیبوں کو مجبور کر دیا تھا مگر اس وقت بھی دیہات کی زندگی اور مسائل بھی اپنی جگہ مسلم تھے اور آج بھی ہیں ان چند سالوں میں دیہات کی زندگی کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔

شہروں کی زندگی میں اگر بیگانگی کا درد، اکیلاپن، نئی جگہوں میں قدم جمانے کی جدوجہد جیسے مسائل تھے تو گاؤں کی زندگی میں بھی غریبی، بھوک، چھواچھوت، سماجی نابرابری جیسے مسائل موجود تھے اور وہ مسائل بھی نئے اور منفرد انداز میں دیکھے جانے کے منتظر تھے۔ دیہات ہندوستانی سماج کا ایک اہم حصہ ہے ہم سب کی جڑیں کہیں نہ کہیں انھیں گاؤں میں موجود ہیں۔ شہروں کی بھیڑ بھاڑ والی مصروف اور پریشان زندگی سے کچھ لمحے نکال کر سکون کی تلاش میں اپنے آبائی گاؤں ضرور جاتے ہیں ایسے میں دیہاتی زندگی اور اس کے مسائل سے آنکھیں چرانا چہ معنی دادر؟

ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں:

''اردو افسانہ کا عام موضوع اگر چہ شہر رہا ہے لیکن وہ عناصر جو کشمکش حیات میں زندگی کو حوصلہ عطا کرتے ہیں اور کائنات کے اسراروں کی نقاب کشائی کرتے ہیں انسان اور فطرت کے رشتے اور ان کی بدلتی ہوئی نوعیتیں ہیں جسے مجرد پرستی یا منظر نگاری تک محدود رکھنا انسان اور فطرت دونوں ہی کی توہین ہے۔ اردو افسانے نے پریم چند کے بعد نہ صرف ان رشتوں کے امکانات کو نظر انداز کیا ہے بلکہ اس نے نئے موضوعات ، تازہ ہوا، اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبوؤں کے لیے بھی اپنے دروازے بند کر لیے ہیں۔ جس کی وجہ سے افسانے میں گھٹن کے احساس میں اضافہ ہو گیا ہے۔

(نیا افسانہ مسائل اور میلانات، مرتب قمر رئیس، مضمون نیا افسانہ مسائل اور تجزیہ، صفحہ 121)

اردو افسانے نے ابتدا ہی سے جو شاہکار نسوانی کردار ہمیں عطا کیے ہیں، وہ جدید افسانے میں مفقود ہے۔ جدید افسانے نے بیشک اپنے موضوعات کا دائرہ وسیع کیا ہے مگر اس دائرے میں نصف آبادی کی شمولیت بڑی ہی مشکوک ہے اگر کہیں یہ عورت نظر آ بھی جاتی ہے تو اس بے نام سی عورت کی اپنی کوئی شناخت نہیں ہوتی، احساسات نہیں ہوتے اس کے اپنے مسائل نہیں ہوتے۔

جدید افسانوں میں نہ صرف عورتوں کے مسائل غائب ہو گئے بلکہ افسانہ نگاری کے میدان میں خواتین قلمکاروں کی تعداد بھی اچانک گھٹ گئی آج جب جدیدیت کا سہرا بلراج مینرا اور ان کے ساتھیوں کے سر جاتا ہے اور جدید افسانہ نگاروں کی فہرست بنائی جاتی ہے ان میں خواتین کے کتنے نام ہیں جنھیں پیش کیا جا سکے؟ یہ بھی غور کرنے والی بات ہے۔

علی احمد فاطمی بڑے ہی متفکرانہ انداز میں لکھتے ہیں:

''پھر کیا ہوا کہ اردو افسانے کے منظر نامے سے عورت اچانک غائب ہو گئی۔ تقریباً ہر سطح پر معقول اور سنجیدہ خواتین افسانہ نگاروں کی تعداد ایک دم گھٹ گئی افسانوں میں خواتین کے مسائل غائب ہو گئے۔ خواتین کے کردار بھی تقریباً۔ افسانوں کے مرکزی کردار و خیال سے عورت میلوں دور اور نہ جانے کہاں معدوم۔'

(نیا افسانہ مسائل اور میلانات، مرتب قمر رئیس، مضمون ، نئے افسانے کی گمشدہ جہت، صفحہ 112)

حالانکہ ہونا تو چاہیے تھا کہ جدید افسانوں میں عورتوں کی شمولیت کا تناسب بڑھتا، کیونکہ جدید افسانے کے عروج کا وقت بھی وہی تھا جب عورتوں نے گھر کی چہار دیواری سے قدم باہر نکال کر دنیا اور اس کے مسائل کا سامنا کرنا شروع کر دیا تھا۔ چہار دیواری کے اندر کے مسائل تو اپنی جگہ موجود تھے ہی، باہری دنیا میں قدم رکھنے سے ان کے مسائل میں مزید اضافہ ہی ہوا تھا۔ یوں جدید افسانے میں خواتین کے مسائل کو پیش کرنے

کی بہت زیادہ گنجائش موجود تھی۔

عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر نے بے شک اپنے افسانے میں مسائل نسواں کو پیش کیا ہے لیکن مرد قلمکار کے لیے یہ موضوع گویا شجر ممنوعہ بن گیا سلام بن رزاق کے ''بجوکا'' کے علاوہ کوئی افسانہ ایسا نظر نہیں آتا جسے جدیدیت میں نمایاں مقام حاصل ہو۔

علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

''اردو افسانے کی روایت بتاتی ہے کہ عورتوں کے مسائل عورتوں نے تو لکھے ہی ہیں۔اس سے زیادہ مردوں نے لکھے ہیں اردو افسانے کے لافانی نسوانی کردار مرد افسانہ نگاروں نے زیادہ دیے ہیں۔ایسا فطری ہے لیکن نئے اردو افسانے سے تخلیق کا یہ فطری عمل کہاں اور کیوں رخصت ہوگیا۔اردو افسانے سے دھنیا، لاجونتی، سوگندھی، ننھی کی نانی، آپا، رضو باجی وغیرہ کہاں روٹھ گئیں؟ انھیں کون واپس لائیگا؟''

(نیا افسانہ مسائل اور میلانات، مرتب قمر رئیس، مضمون ، نئے افسانے کی گمشدہ جہت، صفحہ 116)

متذکرہ افسانوں میں سے کچھ افسانوں کو اگر جدیدیت کے خانے میں ڈال بھی دیا جائے تو حقیقت پر بہت زیادہ فرق نہیں پڑنے والا ہے روایتی افسانہ میں مرکزی حیثیت سماج اور اس کے مسائل کی تھی۔فرد اور اس کے مسائل پر اتنا زور نہیں تھا۔جبکہ جدید افسانے میں فرد اور اس کے مسائل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

انسان کی تنہائی، اس کا ذہنی کرب، اس کا خوف، سماج اور اس کے مسائل پر حاوی ہے حالانکہ فرد اور سماج کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔جہاں افراد ہوں گے وہاں سماج ہوگا اسی لیے تو ارسطو نے انسان کو سماجی جانور کہا ہے۔

جدید دور میں بھی سماج اور اس کے مسائل موجود ہیں۔یہ سماج اور اس کے مسائل ہی ہیں جنھوں نے خوف و دہشت اور سراسیمگی کے عالم میں فرد کو مبتلا کر دیا ہے جدید سماج اور اس مسائل کا ردعمل ہے کہ جدید دور کا انسان داخلی انتشار اور ذہنی کرب کا شکار ہے۔جدید افسانہ اس انتشار اور کرب کا ترجمان تو ہے مگر اسباب و وجوہات و سد باب کے معاملے میں یہاں خاموشی ہے۔

نفسا نفسی کا یہ عالم ہے کہ ہر شخص اپنے مسائل میں الجھا ہوا ہے۔ اسے اپنے مسائل سے فرصت ہی نہیں کہ اطراف میں نظریں دوڑائے اور نہ اسے اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔دوسری طرف وہ اس بات سے شکوہ کناں بھی ہے کہ وہ تنہا ہے اس کا کوئی پرسان حال نہیں مگر دوسری طرف اس کے اندر کسی کی تنہا زندگی میں سہارا بننے کا حوصلہ بھی نہیں ہے۔

اگر ہم سریندر پرکاش کے افسانہ ''رونے کی آواز'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسی ہی تلخ حقیقت سامنے آتی ہے۔

''باہر شاید رات نے صبح کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا ہے ارد گرد کے سب گھروں کی بتیاں بجھ گئی ہیں ہر طرف اندھیرا ہے۔اور خاموشی دیمک کی طرح ہر طرف آہستہ آہستہ رینگے جا رہی ہے۔میں دروازے کی چٹخنی چڑھا کر اور موم بتی جلا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا ہوں مدھم روشنی میں سفید چادر میں لپٹا ہوا اپنا جسم مجھے کفن میں لپٹی ہوئی لاش کی طرح لگتا ہے۔ تنہائی تاریکی اور خاموشی میں ایسا خیال خوفزدہ کر رہی دیتا ہے''

(دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم ایڈیشن 1968، شب خون کتاب گھر۔ صفحہ 17)

اس سے آگے کا بیان ہے:

''مگر یہ تو کسی بچے کے رونے کی آواز ہے میں محسوس کرتا ہوں۔ٹھیک ہے پڑوس والوں کا بچہ اچانک بھوک کی وجہ سے رونے لگ گیا ہوگا اور اس کی ماں بدستور سو رہی ہوگی یا پھر شائد ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ مرگئی ہو اور بچہ بلک بلک کے رو رہا ہو آواز آہستہ آہستہ قریب ہو کر واضح ہوتی جا رہی ہے پھر مجھے لگتا ہے کہ ایک بچہ میرے ہی پہلو میں پڑا رو رہا ہو اور کفن میں لپٹی میری لاش میں کوئی حرکت نہیں ہوتی ہے''

(ایضاً صفحہ 18)

بے حسی کا یہ عالم اسی نئے سماج کی تصویر ہے جہاں ہم اور آپ شکوہ کناں ہیں کہ کوئی کسی کا پرسان حال نہیں۔جدید اردو افسانہ میں جو سماج ہے بھی تو ایک دوسرے سے بے پروا ایک دوسرے کے مسائل سے بیگانہ سماج ہے۔

□□□

Syed Wasifa Ghani
Fellow UGC
Dept. of Urdu
S.P. Jain College
Sahsaram-821115 (Bihar)

عہد حاضر میں کتب بینی کی صورت حال

ڈاکٹر روحی سلطان

ہر وہ تحریر جو کسی بھی شکل میں محفوظ رکھی جائے ''کتاب'' کہلائی جاتی ہے۔یعنی کہ اس میں پھر مٹی کی تختیاں، پیپر کے رول اور ہڈیاں جن پر قدیم زمانے میں تحریریں محفوظ رکھی گئیں ''کتاب'' کی ابتدائی شکلیں تھیں۔دیکھا جائے تو کتاب کی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ کتاب لکھے اور چھاپے گئے کاغذوں کا مجموعہ ہے جن کی جلد بندی کی جائے تا کہ یہ کافی عرصہ تک محفوظ رہیں۔لیکن دورِ جدید میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی بدولت کتاب صرف کاغذ پر چھپی تحریر ہی نہیں بلکہ اب کتاب 'ای بک'،ٹویٹر، انٹرنیٹ اور بک ریڈرز کے ذریعے ڈیجیٹل ہو چکی ہے۔آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق ''کتاب'' سے مراد ایک ایسا تحریری یا مطبوعہ مقالہ ہے جو متعدد صفحات پر مشتمل ہو اور جسے تہہ کر کے ایک طرف سے سجا دیا گیا ہو''۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دو مشہور اقوام کی تہذیبیں وادیٔ دجلہ وفرات سے کتاب کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔برصغیر میں موہنجوداڑو (سندھ) ہڑپہ (پنجاب) اور مہر گڈھ (بلوچستان) سے کھدائی کے بعد جو کھنڈرات تہذیبِ جدید کے افق پر نمودار ہوئے وہاں سے برآمد ہونے والی پتھر کی چھوٹی چھوٹی تختیوں پر تصاویر اور تصویری خاکے دیکھ کر کتاب کے ابتدائی مراحل کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

کتاب کی ابتدا انسان کی پیدائش سے ہی ہوتی ہے۔کاغذ کی ایجاد سے پہلے انسان نے ہاتھی دانت، درختوں کی چھالوں، پتوں، چٹانوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھا۔ارسطو اور افلاطون کے نظریات، مسلمان حکمرانوں اور بادشاہوں کے عدل وانصاف پر مبنی طرزِ حکومت کے قصے، اولیاء، صالحین اور صادقین کی زندگیوں کے ایمان اور یقین کو طاقت دینے والے واقعات کتابوں کے ذریعے ہی ہم تک پہنچے۔

کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کے تقریباً ہر مذہب کے پاس ان کی اپنی ایک متبرک کتاب موجود ہے ان کتابوں اور صحیفوں میں اس وقت کی قوم اور فرقوں کو راہِ راست اور زندگی کے صحیح اصولوں اور ضابطوں پر عمل پیرا ہونے کی جا بجا تلقین کی گئی ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ نے خود انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے پیغمبروں پر کتابیں نازل فرمائیں اور خدا کے پیغامات کا یہ سلسلہ بہ دستور جاری رہا۔حتیٰ کہ اپنے پیغمبر آخرالزماں حضرت محمدؐ کے ذریعے آخری پیغام بھی قرآن مجید کے ذریعے ہی ارسال فرمایا۔قرآن مجید جو دنیا کے لیے آفاقی پیغام پر مبنی ہے اس کی ابتدا ہی ''کتاب'' سے ہوئی یعنی 'ذالک الکتاب لاریب فیہ'۔یوں یہ بات قابلِ غور ہے کہ انسانوں کی ہدایت اور پیغام رسائی کا بہترین ذریعہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کتاب ہی کو ٹھہرایا ہے۔

کتاب سے انسان علم حاصل کرتا ہے علم سے غور وفکر پروان چڑھتا ہے۔غور وفکر انسان کو حکمت ودانائی اور معرفت کی طرف لے جاتا ہے۔کتاب انسان کو طمانیت، شعور آگہی اور وجدان کے خزینے عطا

کرتی ہے۔ کتاب انسانی سوچوں کو گہرائی اور وسعت سے نوازتی ہے۔ علم دنیا میں قوموں کی ترقی اور ملکوں کی خوشحالی کا ایک سچا حوالہ ہے۔ جو بھی قوم علم کا دامن تھامتی ہے دنیا اس کے قدموں میں ہوتی ہے۔ مذہب اسلام علم اور فروغ علم کے سب سے بڑے علمبردار اور داعی کے طور پر ابھرا تھا اس کی تبلیغ و اشاعت کی پہلی اینٹ ہی لفظ ''اقراء'' (یعنی پڑھو) پر رکھی گئی تھی۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے علم ایک آلہ ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اپنی ذات کو پہچانو اور اپنے معاشرے اور کائنات کو پہچان لو یعنی کہ ہمارا تو پہلا استعارہ ہی ''اقراء'' ہے۔ علم کے بغیر انسان اپنے آپ کو نہیں سمجھ سکتا تو کائنات کی دوسری اشیا اور حقائق کی معرفت کیسے حاصل کر سکے گا۔ بے شمار حکمتوں کے ساتھ ساتھ اس میں یہ حکمت ہے کہ کتاب سے تعلق اور ربط پیدا کرنے کے لیے اللہ نے اپنے کلام کا نام ''الکتاب'' رکھا۔ کتاب کتابت سے ہے، جس کا مطلب علم کی طرف اس کا اشارہ ہے۔ اس سے بڑا امرتبہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

کتاب کو گوشۂ نشینی کی ساتھی کہا جاتا ہے۔ انسان اور کتب کا رشتہ قدیم الایام سے ایسے جڑا ہوا ہے جیسے انسان کا رشتہ تہذیب و تمدن کے ساتھ جڑا ہے۔ کسی دانشور کا قول ہے کہ ''اگر دو دن تک کسی کتاب کا مطالعہ نہ کیا جائے تو تیسرے دن گفتگو میں وہ شیرینی باقی نہیں رہتی''۔ یعنی کہ بات کرنے کے طریقے میں وہ قرینہ یا یوں کہیں کہ کشش باقی نہیں رہتی۔ کتابوں کا بغور مطالعہ کرنے سے ٹھوس دلائل اور کسی بھی مدعا یا مسئلے پر بات کرنے کے سلیقے میں بہتری آتی ہے۔ ترقی کے کئی سارے مراحل کو طے کرتے ہوئے ایک عام انسان نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا میں قدم رکھا۔ یہ علم اور کتابوں کا مطالعہ کرنے کی بدولت ہی ممکن ہوا۔ یعنی کہ ترقی کی بنیاد ہی علم اور کتابوں کے مطالعہ سے قائم و دائم ہے۔ انسان کے لیے ''ناممکن'' لفظ کی گنجائش کافی حد تک کم ہو گئی ہے اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ کتب کا مطالعہ کامیابی کی کنجی ہے۔

دورِ جدید کی بات کی جائے تو مطالعے کے لیے نئے نئے ذرائع متعارف ہو رہے ہیں۔ ٹیکنالوجی کے باعث علم کے حصول میں انقلاب برپا ہوا لیکن اس کا یہ قطعی مطلب نہیں کہ کتابوں کی صدیوں پرانی اہمیت میں کمی آ گئی۔ ان کی دائمی اہمیت و افادیت مستقل طور پر اپنی جگہ قائم و دائم ہے یا یوں کہیے کہ روز افزوں اس میں مزید اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

میرے اس مضمون کا مقصد ہے کتب بینی کی جو روایت قدیم زمانے میں قائم تھی دورِ حاضر میں بھی مطالعۂ کتب کو از سرِ نو ویسے ہی زندہ کیا جائے۔ کیونکہ زبان اور ادب کے فروغ کے لیے یہ نہایت ہی ضروری ہے اور اس ضرورت کے پیشِ نظر پرانی کتب اور لائبریریاں محفوظ کرنے کی سعی کی جانی چاہیے۔ اگر ایسا نہ کیا تو دورِ جدید میں آنے والی نسل پر علم حاصل کرنے کے دریچے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے اور پھر قوم جہالت، اندھیرا اور پسماندگی کی شکار ہو گی۔ برصغیر میں دیکھا جائے تو لائبریریاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لائبریریوں کی کمی کے باعث کتب بینی سے دوری بنانے کی ایک وجہ بنتی ہے۔ لائبریریوں کے قیام اور فروغ کے لیے حکومتی سطح پر فوری اور سنجیدہ اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے۔ دورِ حاضر میں زیادہ کتابیں شاعری کی شائع ہوتی ہیں۔ نفسیات، فلسفے اور سائنس جیسے موضوعات پر بہت کم کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ ان بنیادی وجوہات کو دور کرنے کے لیے حکومتی اور نجی سطح پر فوری اور سنجیدہ اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اس قوم کو پستی اور ذلت سے نکلنے کا واحد راستہ علم سے محبت میں ہے۔ آج اس قوم کو کتاب سے مضبوط اور سچی دوستی کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ کتابوں کے مطالعہ سے کوئی بھی صاحب علم انکار نہیں کر سکتا۔ مشرق کی بہ نسبت مغربی ممالک میں دورِ حاضر میں بھی کتابیں لکھنے اور پڑھنے کا رواج ابھی قائم ہے۔ ماہرینِ طب اور دانشوروں کا کہنا ہے کہ انسان کی بڑھتی عمر کے ساتھ دماغ کے خلیے کمزور ہو جاتے ہیں لیکن مطالعہ کو روزمرہ زندگی میں معمول بنانے سے دماغ کی ورزش ہوتی ہے۔ اس طرح سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت برقرار بھی رہتی ہے اور مسلسل اضافہ بھی ہوتا ہے جب کہ ای باکس، ای ریڈر اور لیپ ٹاپ پر مطالعے سے ہماری صحت پر برے اثرات پڑتے ہیں اور تھکان بھی محسوس ہوتی ہے۔

ان برقی آلات کی شعاعوں سے دماغ پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں جبکہ کتاب کے مطالعے سے ایسا نہیں ہوتا جب کسی دلچسپ کتاب کو مطالعہ کی غرض سے ہاتھ میں لیا جاتا ہے تو دل میں ایک خواہش پیدا ہوتی ہے کہ صفحہ بہ صفحہ پلٹا جائے اسی اثنا میں کتاب کب مکمل ہوتی ہے اس کی خبر ہی نہیں رہتی۔ کتاب کی اہمیت سدا قائم و دائم رہے گی۔ اس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ نوجوان نسل جو کہ کل کو قوم کا معمار ہوں گی ان کے مزاج میں کتب بینی کی عادت کو مستقل طور پیدا کیا جانا چاہیے۔ جب ہی تو یہ اپنے آباء واجداد کے تجربات اور مشاہدات سے مستفید ہوں گے۔

ترقی یافتہ ممالک میں انگلشتی انقلاب برپا ہونے کے باوجود بھی کتب بینی کے رجحان میں کوئی کمی نہیں۔ ایسے ممالک میں تقریباً ہر گھر میں عمدہ کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ یعنی کہ ان کی ضروریات

زندگی میں کتب بینی بھی باقی اشیا کی طرح شامل ہے۔ امریکہ، جاپان، چین، لندن، پیرس، کینیڈا، آسٹریلیا، اٹلی اور فرانس ایسے ممالک ہیں جہاں سب سے زیادہ کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ دنیا میں اٹھائیس سے زیادہ ممالک ہیں جہاں کتابیں زیادہ فروخت ہوتی ہیں۔

اچھی کتابیں ہماری محسن وغم خوار ہوتی ہیں گوشۂ تنہائی میں ہمارے لیے ایک بہترین درست ثابت ہوتی ہیں۔ کتب بینی سے بلند پایہ مصنفوں کے خیالات، عظیم شعرائے کرام کے کلام اور بزرگوں کی حالاتِ زندگی کے بارے میں جانکاری حاصل ہوتی ہے کہ کس طرح انھوں نے دنیا کی تلخیوں کے گھونٹ پیے ایک ملک سے دوسرے ملک میں جا کر قوانینِ قدرت کا مطالعہ کیا۔ برسوں کے غور وفکر کے بعد فطرت کے سربستہ رازوں کو منکشف کیا اور ان کے اس علم کی لازوال دولت کو محفوظ رکھا گیا ہے تاکہ آنے والی نسل ان کے تجربات اور مشاہدات سے فیض یاب ہو سکے۔

عمدہ کتابوں کا مطالعہ انسان کو مہذب بنانے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ شخصیت میں نکھار اور وقار پیدا ہوتا ہے۔ کتابوں سے دوستی انسان کو شعور کی نئی منزلوں سے روشناس کرواتی ہے۔ کتب بینی کے شائقین تسکینِ قلب کے لیے کتب خانوں کا رخ کرتے ہیں اس ضرورت کے پیشِ نظر تقریباً ہر محلے میں عوامی کتب خانے قائم کیے جانے چاہیے جہاں تمام موضوعات پر کتب موجود ہوں۔

کتاب اور طالب علم کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ایسے ہے جیسے کہ روح اور جسم کا۔ مگر انگشتی انقلاب کی بدولت ان کا یہ ساتھ ٹوٹتا ہوا نظر آرہا ہے۔ انٹرنیٹ، کیبل اور جدید موبائل کی ٹیکنالوجی نے آج کے انسانوں کو تنہا کر دیا ہے۔ سب سے جڑ کر بھی بنیادی طور پر کسی کے ساتھ نہیں ہوتا۔ دماغ میں خرافاتی چیزیں گھر کر لیتی ہیں۔ فضول چیزوں میں وقت گزاری ہوتی ہے۔ وقت تو اللہ کی ایک نعمت ہے وقت ہاتھ سے نکل گیا پھر نہایت مشکل ہے اسے واپس لانا یا یوں کہیے کہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ اس لیے اس کو ضائع کرنا خودکشی کے مانند ہے فرق صرف اتنا ہے کہ خودکشی ہمیشہ کے لیے زندگی سے محروم کر دیتی ہے جبکہ وقت ضائع کرنا انسان کو ایک محدود وقت تک مردہ ثابت کرنے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ جب تک انسان کی طبیعت اور دل و دماغ مفید کاموں میں مشغول نہ رہے، اس کا میلان ضرور بدی کی طرف زیادہ رہے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہر کام کے لیے وقت مقرر کیا جائے تاکہ زیادہ وقت ضائع نہ ہو۔

کتب بینی نہ صرف انسان کے وقت کو ضائع ہونے سے بچاتی ہے بلکہ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی راہ پر گامزن ہونے میں مددگار ثابت ہوتی ہے اور پھر اسی روشنی میں یہ اپنا محاسبہ کرتا ہے۔ اپنے آپ کو مکمل طور پر سمجھنے لگتا ہے۔ اپنی اچھائیوں اور برائیوں سے باخبر ہونے لگتا ہے۔ تو ایسا کر کے ایک انسان کی باصلاحیت شخصیت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔

لوگوں کی آپسی دوستی کبھی کبھی فساد اور بگاڑ کی وجہ بن جاتی ہے لیکن کتاب سے دوستی کے نتیجے میں روح کو تازگی اور طبیعت کو سرور ملتا ہے انسانی ذہن وفکر کی آبیاری ہوتی ہے، تہذیب وثقافت کے عمدہ سانچے میں ڈھلنے کی ترغیب ملتی ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب معلوم ہوتے ہیں۔ تاریخ کی برگزیدہ ذی شعور اور ذی عزت اشخاص سے ملاقات ہوتی ہے۔

□□□

Dr. Ruhi Sultan
Kanispora
Baramulla-193103 (J & K)

ڈاکٹر جاوید اختر

کہکشاں انجم
کا افسانوی سفر

ابتدا سے ہی صوبہ بہار علم وادب کے حوالے سے توجہ کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کی ادب اور دانشوری کی روایت بہت قدیم ہے۔ یہ خطہ مشرقی علم وادب کا اہم مرکز رہا ہے یعنی تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ دبستانِ عظیم آباد کی تاریخ مستحکم رہی ہے۔ اس دبستان سے اردو زبان وادب کی آبیاری میں اپنا خون پسینہ لگاتا رہا ہے۔ صوبہ بہار میں اردو زبان وادب کے ادباء وشعرا کی بہتات رہی ہے۔ یہاں صرف مرد ادبا وشعرا نے اردو زبان وادب کی آبیاری کی ہے بلکہ خواتین ادیباؤں نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ خواتین شعرا ہوں یا یا خاتون افسانہ نگار بھی نے اپنا اپنا مقام بنایا ہے۔ عالمی سطح پر اردو ادب میں پروین شاکر کو جو بھی مقبولیت حاصل ہوئی وہ ان کی ذہانت اور شاعری کے عوض ان کو ملی تھی۔ ان کے آباؤ اجداد بھی صوبہ بہار کے رہنے والے تھے۔ اسی طرح نثر کے میدان میں صوبہ بہار کی متعدد خواتین افسانہ نگاروں نے اردو زبان وادب کی آبیاری کی ہے۔ ان میں شکیلہ اختر، اعجاز شاہین، قمر جہاں، ذکیہ مشہدی، اشرف جہاں وغیرہ نام سرفہرست آتے ہیں اسی ذیل میں کہکشاں انجم کا بھی نام خاص طور پر لیا جاسکتا ہے۔

کہکشاں انجم کی پیدائش صوبہ بہار کے ڈمراؤں (شاہ آباد) میں 1945 میں ہوئی۔ ان کا اصل نام مہہ جبیں ہے۔ وہ فی الوقت گڑگاؤں میں مقیم ہیں۔ انھوں نے صرف میٹرک تک کی تعلیم حاصل کی مگر بہ حیثیت افسانہ نگار انھوں نے اپنا نام روشن کیا۔ کہکشاں انجم کا پہلا افسانہ بعنوان '15 اگست'، حیدرآباد کے ایک رسالہ 'نیا سنسار' میں 1959 میں شائع ہوا تھا۔ ان کے کل افسانوں کی تعداد ایک سو سے متجاوز ہے۔ ان کے تقریباً تمام افسانے مقبول ہوئے لیکن چند افسانوں کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان میں 'انتظار کے قیدی'، 'یادوں کے چراغ'، 'پتھر کا گلاب'، 'دوراہا' اور 'نئی سحر' وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ کہکشاں انجم کے اب تک کل 3 افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جنھیں حلقہ ادب میں قبولیت کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ ان میں 'کہکشاں' (2003)، 'کرچیاں' (2006) اور 'اجالے اپنی رفاقتوں کے' (2010) شامل ہیں۔

بہار کی اہم خواتین افسانہ نگاروں میں کہکشاں انجم کا نام اور مقام دونوں طے ہو چکا ہے۔ وہ ایک سینئر افسانہ نگار ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'کہکشاں' کو خاطر خواہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ 'کرچیاں' کو بھی قارئین ادب نے سراہا اور اسی سے حوصلہ پا کر انھوں نے تیسرا افسانوی مجموعہ 'اجالے اپنی رفاقتوں کے' کو منظر عام پر لانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس بابت وہ خود لکھتی ہیں:

''امید سے زیادہ، توقع سے بڑھ کر--- حوصلہ افزائی نے یہ تیسرا افسانوی مجموعہ ترتیب دینے پر مجبور کیا، یہ کہانیاں لکھتے ہوئے اپنی کاوش کا اس بار بھی اچھا صلہ پانے کی امیدیں بھی روشن ہیں۔''

(دو باتیں۔ کہکشاں انجم، مجموعہ 'اجالے اپنی رفاقتوں کے'، ص:7)

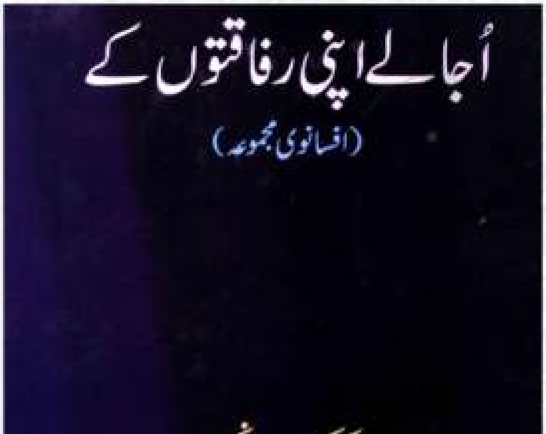

کہکشاں انجم کے افسانے 14 برس کی عمر سے ہی شائع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ ایک کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے ملک کے مقبول اور معیاری رسالوں میں متواتر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انھوں نے جب لکھنا شروع کیا تب جدیدیت کا دور تھا مگر وہ کسی تحریک سے خاطر خواہ متاثر نہ ہوئیں بلکہ اپنا ایک الگ طرز اظہار بنایا اور ایک الگ شناخت بنائی۔ حسین الحق لکھتے ہیں:

''کہکشاں انجم اردو افسانے کی تاریخ کا ایک قابل ذکر نام ہے۔ ناممکن ہے کہ اردو کی خواتین افسانہ نگاروں کا ذکر ہو اور کہکشاں انجم کو فراموش کیا جا سکے۔''

(تاثر 'کرچیاں' (افسانوی مجموعہ)، حسین الحق (گیا) ٹائٹل پیج)

کہکشاں انجم میں بچپن سے ہی مطالعے کا شوق ابھرنے لگا تھا۔ رسالے اور کتابیں خوب پڑھتیں۔ جس کے پیچھے ان کا فنون اور شوق کارفرما تھا۔ انھیں لکھنے کا شوق وراثت میں نہیں ملا تھا البتہ ان کے گھر میں کتابیں اور رسالے بہت آتے تھے، جن سے وہ پڑھنے کی طرف راغب ہوئیں۔ رسالوں میں کھلونا، پھلواری، غنچے وغیرہ جیسے بچوں کے رسالے خوب پڑھتیں۔ اسی طرح نوجوانی میں جمالستان، بیسوی صدی، شمع، دین و دنیا، خاتون مشرق اور جاسوسی دنیا جیسے رسالے جو اس وقت کے معروف رسالے تھے، ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا تھا۔ پڑھتے پڑھتے لکھنے کا شوق پیدا ہوا اور لکھنے کے ساتھ ہی چھپنے بھی لگیں۔ مطالعے کی عادت نے انھیں کہانی نویس بنا دیا۔ ان کے افسانے آہستہ آہستہ بیسویں صدی (دہلی)، بانو (دہلی)، زیور (پٹنہ)، سہیل (گیا) اور مریم (لکھنؤ) میں شائع ہوتے رہے۔ ابھی لکھنے اور چھپنے کا سلسلہ اپنے ابتدائی مرحلے سے گزر رہا تھا کہ شادی کے بندھن میں بندھ گئیں۔ گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے لکھنے کا سلسلہ رک سا گیا تھا۔ مگر انھوں نے پھر سے پڑھنے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

موضوع: جہاں تک کہکشاں انجم کے افسانوں کے موضوعات کی بات ہے وہ قریب قریب وہی ہیں جو ایک ذی حس خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں نظر آتا ہے۔ مردانہ سماج اور اس کے ذریعے بنائے گئے رسم و رواج، سماج میں پھیلی ہوئی برائیاں، اندھی عقیدت اور بوسیدہ روایتوں کے خلاف انھوں نے قلم اٹھایا ہے۔ آج کے سائنسی دور اور تکنیکی دور میں بھی سینکڑوں گھر کی تباہ کاریاں، ساس اور بہو کے قصے اور نند اور بھابھی کے تنازعہ جیسے مسائل کی طرف کہکشاں انجم نے اپنے افسانوں کے ذریعے آواز اٹھانے کی اچھی کوشش کی ہے۔

کہکشاں انجم نے 1944 سے 1968 کے بیچ متعدد افسانے لکھے۔ یہی دو سال کا عرصہ ان کے افسانوی سفر کا دور زریں کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے لکھنا کم کر دیا تھا مگر ترک نہیں کیا تھا۔ یوں تو ان کے معیاری افسانوں کی تعداد بہت ہے مگر ایک افسانہ 'شیشہ اور کرچیاں' (جو ان کے افسانوی مجموعے 'کرچیاں' میں شامل ہے) بہت مقبول ہوا۔

اس افسانے میں انھوں نے عورتوں کے روزمرہ کی زندگی میں

پیش آنے والے مسائل کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔ نقاد وہاب اشرفی نے کہکشاں انجم کے بارے میں لکھا ہے:

''استحصال کے عوامل پر توجہ کرتے ہوئے وہ کوئی باغی مزاج پیدا کرنا نہیں چاہتیں۔ لیکن اس صورت کو بدلنے پر اصرار ضرور کرتی ہیں وہ بھی نئے طریقے پر۔''

(تاریخ ادب، جلد سوم: ڈاکٹر وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2008، ص:1338)

یوں تو کہکشاں انجم نے مختلف موضوعات پر افسانے لکھے ہیں مگر عورتوں کے مسائل کے حل پر توجہ مرکوز کر کے انھوں نے متعدد افسانے تحریر کیے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ایک روایت قائم کر رکھی ہے جس کی ایک منفرد شناخت ہے۔

زبان و اسلوب: جہاں تک کہکشاں انجم کے افسانوں کے زبان و اسلوب کا تعلق ہے تو انھوں نے اپنے افسانوں کو موثر بنانے کے لیے صاف ستھرے، سہل اور ایک خاص اسلوب کا سہارا لیا ہے۔ روز مرہ کی زندگی میں مستعمل محاورے اور ضرب المثل ان کی کہانیوں کی پہچان ہیں۔ عورتوں کی خدمات کی ترجمانی میں ان کا خاص اسلوب ہی کہکشاں انجم کا وصف ہے۔ اس سلسلے میں افسانہ نگار ڈاکٹر قیام نیر لکھتے ہیں:

''کہکشاں انجم زبان آسان اور عام فہم استعمال کرتی ہیں۔ طرز اظہار اچھا اس لیے ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کی گھریلو زبان استعمال کرتی ہیں۔''

(بہار میں اردو افسانہ نگاری، ڈاکٹر قیام نیر، مطبع آزاد پریس، پٹنہ، 1994، ص:410)

کہکشاں انجم ایک ایسی افسانہ نگار ہیں جن کے پاس مشاہدے اور مطالعے کی کمی نہیں۔ اس لیے ان کے افسانے موضوع اور مواد دونوں لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ ان کے یہاں افسانوں میں برتے گئے اسلوب بھی قابل داد ہیں کہ جس کی مدد سے افسانہ قابل فہم اور سہل ہو جاتا ہے۔ کہکشاں انجم کا شاعرانہ انداز بیان بھی ان کے بعض افسانوں میں دکھائی دیتا ہے۔ ان کے کئی اہم افسانوں کے عنوانات بھی کسی شعر یا مصرع اور ٹکڑے سے لیے گئے ہیں مثلاً ''زندگی اتنے سے اشارے پہ ٹھہر جائے گی''، 'کب کے بچھڑے......!، عمر بھر کی بے قراری کو......!، راہیں ہوئی اندھیریں......! ابن مریم ہوا کرے کوئی......!، یہ عشق نہیں آساں......!، دل ڈھونڈتا ہے......! وغیرہ۔

کہکشاں انجم کے افسانے بیانیہ ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا انداز بیان شگفتہ رواں اور رشستہ ہے۔ ان کے افسانوں میں مکالماتی زبان کا بھی استعمال ہوا ہے۔

کہکشاں انجم کے افسانوں میں مکالمہ پر تاج پیامی لکھتے ہیں:

''افسانوں کا انداز بیان نہایت شگفتہ رواں اور رشستہ ہے۔ زیادہ تر افسانے بیانیہ ہیں اور بیانیہ افسانوں کی ساری خوبیاں یہاں موجود ہیں...... مکالمہ بہت کم ہے مگر اس کے باوجود مکالمہ کی ساری خوبیاں ان کم مکالموں میں بھی موجود ہیں۔ مکالموں کے ذریعے کردار کی تہذیبی و تمدنی پس منظر، اخلاقی پہلو کے علاوہ جذبات کے نشیب و فراز کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مکالمہ دراصل قول کا معیار ہوتا ہے۔''

(کہکشاں انجم کے افسانوی مجموعہ 'کرچیاں' پر ایک نظر۔ تاج پیامی (فلیپ پر درج مجموعہ 'اجالے اپنی رفاقتوں کے')

مختصر یہ کہ کہکشاں انجم نے بہ حیثیت افسانہ نگار اپنا مرتبہ بلند کر لیا ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات اور ان افسانوں میں استعمال کی گئی زبان و اسلوب ہی کہکشاں انجم کی شناخت ہے اس طرح مستقبل میں ان سے مزید توقعات وابستہ ہیں۔

Dr. Jawed Akhtar
S/O. Mr. Jameel Akhtar.
Vill+Post: Kumhraulivia: Kamtaul
Dist.: Darbhanga-. 847304 (Bihar)

محمد شاہد

عالم آرا بیگم کی شاعری

شرقیہ زبانوں کی شاعری میں صنفِ نازک کی حصہ داری نسبتاً کم رہی ہے۔ ہندوستان میں بھی صنفِ نازک کی سخن گوئی کے تعلق سے ماضی کی فضا بہت سازگار نظر نہیں آتی۔ مغلیہ دورِ حکومت میں شہزادیوں اور کنیزوں نے شعر گوئی میں حصہ لیا، تاہم ان کا بیشتر حصہ ہم تک پہنچنے سے قاصر رہا۔ شہزادیوں سے منسوب کچھ بکھرے اشعار عہدِ معاصر تک محفوظ ہیں، اس کے علاوہ کچھ دواوین بھی ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں قارئین کے منتظر ہیں۔ مغلیہ سلطنت کے آخری عہد نے اپنی تنگ دامانی کے باوجود دوسری بہت سی روایتوں کو پروان چڑھایا، جن میں طوائف کو بھی اہم مقام حاصل ہوا۔ اس دور میں عورتوں کو دل بہلانے کا ذریعہ سمجھا گیا اور اس طرح سے کوٹھے قائم ہوتے گئے اور مجرا کرنے والیاں بھی تہذیب و معاشرت کا اہم حصہ بن گئیں۔ اس طرح شعر و ادب میں ان کی حصہ داری بھی نظر آنے لگی۔ انھوں نے اپنی دلربائی کے اظہار کے لیے شاعری کو وسیلہ بنایا اور اشعار سے سامعین کے آزردہ دلوں کی پزیرائی کرنے لگیں۔ اگرچہ یہ فعل ناشائستہ تھا لیکن اس کے نتیجے میں نسائی ادب کو ترقی ملی اور کچھ ادبی سرمایہ ہمارے سامنے آیا۔ عورت زدہ معاشرہ یہاں تک آ پہنچا کہ بعض شاعروں نے زنانی فطرت اختیار کی اور ریختہ کے ساتھ ریختی بھی خود ہی کہنے لگے۔ شعراء ریختی کہہ کر کوٹھوں پر بھیجنے لگے۔ مغنیہ اور رقاصہ کی گھنگرو کی کھنک میں کلام مقبول ہوتے رہے اور شعراء گھر بیٹھے کلام کی داد پاتے رہے۔ انھوں نے اس جانب بھی توجہ نہ دی کہ پائل کی ہر جھنکار میں پوشیدہ نغمے اپنی شناخت چاہتے ہیں، ان میں بہت سی شاعرہ کی آواز طبلے اور ڈھولک کی تھاپ کی نذر ہونے کی بجائے ذوقِ ہستی کے لیے اپنی نمو چاہتے ہیں۔ جو شعراء دربار سے وابستہ رہے انھوں نے ملکہ، شہزادی، بادشاہ زادی اور نواب زادی کی شعری تربیت کو اپنا وظیفہ مان کر فریضہ جانا اور شاعرات کے معلم کے طور بھی سامنے آئے۔ البتہ ان میں ایسی شاعرات بھی تھیں، جنھیں کسی استاد شاعر کی سرپرستی حاصل نہ تھی، گومگو کی کیفیت سے دوچار بہتر کلام کہہ کر دریا برد کر دیا۔ متقدمین، متوسطین اور متاخرین ادوار کی بنسبت معاصرین شعراء نے شاعرات کی ذہن سازی زیادہ کی۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ کہنہ مشق اساتذہ شاعرات میدانِ شعر گوئی میں نئی پود کی رہنمائی کے ساتھ اپنے شعر گوئی کی چھاپ بھی چھوڑتی نظر آتی ہیں۔ لہٰذا شعر گوئی کا پرچم ہر موضوئی طبع ذی روح کی دسترس میں آئی اور اس پر خواص کی اجارہ داری نہیں رہی۔ عہدِ معاصر میں مشاعرے میں شاعرات کی شمولیت کو مشاعرے کی کامیابی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نسوانی آواز ہی سامعین کی دھڑکنوں کو دوبالا کرنے کے لیے کافی ہوا کرتی ہے۔ اگر شعر اچھے نکل آئے تو یہ دوآتشہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے گویا اب شاعرات سکۂ رائج الوقت ٹھہری ہیں۔

یہاں شاعرات کی آمد کا فسانہ برسبیل تذکرہ در آیا ہے تاکہ منظر نامہ ہمارے سامنے رہے۔ ابھی تو ہمیں انیسویں صدی کی شاعرہ ملکہ بادشاہ محل عالم کا دیوان ''بیاضِ عشاق'' پر گفتگو کرنی ہے۔ عالم آرا بیگم بادشاہ محل

نواب واجد علی شاہ اختر کی پہلی بیگم تھیں۔ جب واجد علی شاہ کلکتے آئے تو عالم آرا بیگم بھی کلکتے آگئیں۔ ''بیاضِ عشاق'' ان کے کلام کا مجموعہ ہے۔ اس میں 114 غزلیات، 15 رباعیات اور تین مخمسات بھی ہیں۔ لیکن کم کم۔ کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ عالم ایک پرگو شاعرہ تھیں۔ لکھنؤ کی ادبی فضا، دربار کا پُروقار ماحول اور شوہر کی سخن گستری کی وسیع جولانگاہیں ان کے سامنے تھیں۔ یہ ماحول ان کے ذوقِ شعر کو جلا بخش رہا تھا۔ ملکہ نے طبقۂ نسواں کی ذوقِ شعر گوئی کو اس زمانے اوجِ ثریا پر پہنچایا۔ وہ بلا جھجک اپنے نسائی خیالات وافکار کے موتیوں کی مالا غزلیہ اشعار کی صورت میں پروتی رہیں۔ انھوں نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور اپنے افکار و خیالات کو اس سلیقے سے برتا ہے کہ قاری داد دیے بنا نہیں رہ سکتا۔

شاعری وجدانی کیفیت کے اظہار کا نام ہے۔ وجدانی کیفیت میں اظہارِ عشق کی اپنی الگ اہمیت ہے۔ شاعری زندگی کی داخلی اور خارجی نمائندگی سے خالی نہیں اور اگر خالی ہے تو اس میں خلل ہے۔ اس کائنات کی تخلیق کا سبب عشق ہے۔ صحائف آسمانی کو اٹھا کر دیکھیے خالق کا اپنی مخلوق سے اور مخلوق کا خالق سے عشق ثابت ہے۔ دنیا کی عمارت عشق پر ہی قائم ہے، جو کبھی شعوری تو کبھی غیر شعوری طور پر اظہار کی راہ پاتا ہے۔ ہر ذی روح میں عشقیہ عناصر کے ارکان ودیعت خداوندی ہیں۔ لہذا شاعری کا مرکز ومحور بھی عشق ہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عشق کے درجات بھی الگ الگ ہیں اور نوعیت بھی جدا ہوا کرتی ہے۔ اردو شاعری نے عربی اور فارسی شاعری کی عشقیہ روایت کے سائے میں پرورش پائی تھی، اس لیے ابتدا اس میں عشق کے اعلیٰ معیار و تجربے کی روایت کی بجائے جنس مخالف کے نازک جذبات کے اظہار کی کیفیت مقدم رہی اور ایسا ہونا ایک ناگزیر عمل بھی تھا کہ کسی کی زبان بھی شاعری میں فکراً چانک اپنے علو کو نہیں پہنچ جاتی۔ پھر یہ کہ زمانے کے اثرات بھی شاعری پر ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ ملکہ کے اشعار کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ ان کے یہاں عشق شیخ سعدی یا حافظ کے تخیل کی بلندی اور فکر کے علو تک نہیں پہنچتا تو ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ سعدی حافظ تو چھوڑیے یہاں تو میر کا ہجر اور سودا کا شکوہ بھی نہیں۔ عالم کی غزلوں میں عشق کی بازگشت ہے، جو سادہ اور سلیس انداز میں بیان ہوئے ہیں:

عشقِ بتاں سے ہاتھ جو عالم اٹھا لیا
شکرِ خدا کہ جان کا خوف و خطر گیا
خانہ جنگی ہوئی نہ عشق کی کم
کبھی اس کا نہ سدِ باب ہوا
عشق میں جان نہ دی کہتا ہے مجھ سے ناصح
بے وفا سارے زمانے سے ہے دلدار ترا
آنکھیں ہوتی ہیں چار اس گل سے
عشق میرے گلے کا ہار ہوا
آتشِ عشق سے دل آٹھ پہر جلتا ہے
شمع سانِ سینۂ فانوس کے اندر میرا
عشق گر چہرے سے میرے نہ ہویدا ہوتا
یوں جہاں میں نہ ہر اک سو میرا چرچا ہوتا ہے
یہ حال عشق میں کس کے ہوا کہو تو سہی
ہلال کیوں ہوئی اے مہ لقا کہو تو سہی
عشقِ صادق کا تھا گمان ہم کو
پر ہوا اب یہ امتحان ہم کو

ظاہر ہے عشق کے اظہار میں یہاں خیالی باتیں ہیں برائے شعر گفتن ہیں۔ اس طرح کے بہت سے اشعار شاعرہ کے دیوان میں موجود ہیں، جن میں لطافت، خوبی، شستگی اور حسنِ بیان بھی ہے۔ عالم کی شاعری ایک عورت کے دل کی آواز ہے، جہاں وہ ایک چاہنے والے کی صورت میں دل کی متلاشی نظر آتی ہیں۔ وہ عشق کو انسانی زندگی کا حاصل تصور کرتی ہیں، جو انسانی زندگی کے معمول میں شامل ہوا کرتا ہے۔ اگرچہ کچھ اشعار

ان کی بے باکی اور برجستگی کی ظاہراً نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں، لیکن بباطن ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ بہت سے اشعار میں عشق ایک عبادت کا روپ دھارے کھڑا ہے۔ان کی شاعری میں معاملہ بندی، شوخی، عشقیہ جذبات کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، واردات قلبیہ کا بلا جھجک اظہار اور عشق میں لعن طعن، لذت پرستی، بوسہ بازی، عشق کے فائدے، عشق میں نقصان، عشق میں بدنامی، عشق میں امتحان، عاشق صادق کی تلاش، محرم و ہمراز سے دھوکہ کھانا وغیرہ کبھی تلازمہ تو کبھی مضامین کی صورت میں ملتے ہیں:

مرے سنبھالے نہیں آج یہ سنبھلتا ہے
الٰہی خیر ہو کچھ رنگ ہے بُرا دل کا
بیتابی سے بل کھانے لگا کیوں دل بیتاب
یاد آگیا کیا گیسوئے خمدار کسی کا
بیوجہ نہیں حال دل اپنا متغیر
شاید کہ ہوا عشق نمودار کسی کا

عالم کی غزل گوئی میں عشق مجازی کی گونج اس قدر تیز ہے کہ اگر کوئی شعر عشق حقیقی کے معنیٰ میں آ بھی جائے تو دونوں کی تفریق کرنی آسان نہیں۔ یہاں عاشق اور معشوق کی گفتگو ایک زبان سے ادا ہو رہی ہے۔ ہر شعر میں محبوب گوشت پوست کا جیتا جاگتا، چلتا پھرتا، کھاتا پیتا انسان ہے اس لیے شاعری میں تکلفات نہیں، براہ راست مدعا کا اظہار ملتا ہے۔ کلام میں نزاکت اور لطافت اس قدر جاگزیں ہے کہ ایک لمسیاتی حس بیدار ہوتی نظر آتی ہے۔ ادق اور فلسفیانہ گفتگو کا کلام میں گزر نہیں اور نہ ہی کلام کو الفاظ کے پر پیچ فضاؤں کے حوالے کیا گیا ہے۔ اخلاق و راہ و رسم اور آداب زندگی کے تعلق سے اشعار ملتے ہیں۔ وہاں خشک مزاجی کا دخل نہیں۔ پند و موعظت کے تعلق سے جو اشعار ملتے ہیں ان میں ایک کامیاب مبلغہ کا روپ نظر آتا ہے:

عشق کرنا نہیں آساں کسی سے پیارے
دل کو کر دیتا ہے عاشق کے دو پارہ اخلاص
زندگی تک ہے بکھیڑا عاشق و معشوق کا
بعد مردن ہے کسے گور غریباں سے غرض
بھٹکے ہیں راست باز رہِ کعبہ و کنشت
پھرتے ہیں بھکے عشق میں وہ در بدر غلط
غیروں سے ربط تم نے کیا ہے اگر شروع
انصاف سے کہو یہ ہوا کس سے شر شروع

لکھنوی شاعری نفاست، لطافت، خوان نعمت اور عیش و عشرت کی غماز رہی ہے۔ یہاں عاشق اور معشوق کی زندگی اس قدر دو بھر نہیں کہ وصل کے بنا پران کا قصہ تمام ہو جائے۔ یہاں صرف نام پر زندگی نثار کرنے والے کم نظر آتے ہیں۔ان دیکھے محبوب کی چاہت اور بلا کی محبت سے میدان خالی ہے۔ یہاں وہ مشقتیں نہیں ہیں جو قدماء کا طرۂ امتیاز رہا تھا۔ یہاں عشق و عاشقی کا کھلا اظہار ہے قدماء کے عشقیہ کلام کی وہ پاکیزگی نہیں جہاں راہِ اظہار میں سو تکلفات اور سو بکھیڑے تھے۔ زندگی خار زار وادیوں سے گزرتی تو ہے یہاں لیکن ہر خزاں کے بعد بہار ہی بہار ہے۔ یہاں کوئی ایسا فرہاد نہیں جو کوہکن ثابت ہو سکے۔ معشوق کی چاہت اور دیدار معشوق میں گریہ وزاری اور نالہ و فریاد کا شور سنائی نہیں دیتا اور اگر شور ہے بھی تو وہ سوز سے خالی ہے۔ چشم اشارہ کناں ہیں، حسن کا برملا اظہار ہے اختلاط و میل جول کی طلب تو ہے لیکن راہ میں کوہ گراں نہیں۔ وصل کی آرزو میں عاشق صحرا نوردی کرنے کے بعد نامرادی سے ہمکنار نہیں ہوتا۔ اس طرح کی فکر اور ایسا اظہار یہ عالم کی شاعری میں بھی ملتا ہے لیکن کم کم۔

خود ہوئے رسوا مجھے رسوا کیا
جس جگہ بیٹھے مرا چرچہ کیا
بیوجہ نہیں حال دل اپنا متغیر
شاید کہ ہوا عشق نمودار کسی کا
پھنس گیا دل بے طرح یارب کروں تدبیر کیا
دیکھوں دکھلاتی ہے اب مجھ کو مری تقدیر کیا

عالم کی شاعری ایک وفا شعار دل کی آواز ہے۔ان کے کلام میں لکھنوی تہذیب و تمدن کی جھلک ہے اور ہونی بھی چاہئے۔ لیکن ساتھ ہی شرم بھی دامن گیر ہے۔ان کا مزاج عشق کو بہت حد تک عطیہ خداوندی سمجھتا ہے۔ عشق و محبت کے تمام رموز و اوصاف سے بہرہ ور برملا اظہار کو حق مانتی ہیں لیکن ساتھ ہی اس کی بے حرمتی کو فعل قبیح گردانتی ہیں دراصل عالم کی شاعری ایک دل رکھنے والے صنم کی آواز ہے جو مختلف موقعوں پر بدلنا جانتے ہیں لیکن حد سے گرنے کو برا مانتے ہیں۔ یہ ایسا صنم ہے، جو روپ بدل بدل کر اپنی محبت اور عشق کا غوغا کرتا ہے، جس میں آہ بھی ہے، سوز بھی ہے، چاہ بھی ہے اور تہدید و کراہ بھی ہے۔ ناصح اور واعظ کا فریضہ بھی نبھانا نہیں بھولتا اور عشق کے وظیفہ کو زندگی کی علامت گردانتا ہے:

جس کی الفت میں بجز رنج نہ راحت پائی
ایک دن وصل سے اس نے نہ کیا شاد مجھے
لطف کیا ہے جو ہو زباں سے بیاں
عشق وہ ہے کہ شکل سے ہو عیاں

غزلیہ شاعری کی جان عشق ومحبت کا حسین بیان سمجھا گیا ہے، عالم کی شاعری میں حسن وعشق کی تمام واردات جستہ جستہ ادا ہوئے ہیں۔ان کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ وہ عشق ومحبت کے جس مضمون کو باندھتی ہیں پورے طور پر اس کا خاکہ ہماری نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔لفظیات کے استعمال پر قدرت حاصل ہے، جو لفظ جس معنی میں استعمال ہوئے ہیں کما حقہ اس کی نمائندگی ہوتی ہے مثال کے طور پر ذیل کا شعر دیکھئے کہ حقیقت کس طرح آشکار ہوتی ہے:

صبح سے شام ہوئی در پہ کھڑے ہیں مشتاق
بام پر آیا نہ کیوں وہ مہہ تاباں اب تک

عالم کے کلام میں تمام فنی محاسن پوری صحت کے ساتھ موجود ہیں، جو استعارے استعمال ہوئے ہیں وہ نہایت ہی عمدہ ہیں، وہاں ابہام کی کیفیت نہیں بلکہ روشن و با معنی ہیں۔عام طور پر اس طرح کے استعارے قدماء کے یہاں وافر تعداد میں موجود ہیں، ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے استعاراتی نظام کی فصیل کو آسان اور قابلِ فہم بنایا ہے اور یہی حسن ان کی غزلیہ شاعری کی جان ہیں:

بلبلوں کون سی تقصیر ہوئی ہے گل سے
یک قلم چھوڑ دیا تم نے جو گلزار کا رخ

گو نہیں دعویٔ مسیحائی
پر ہمارے لیے دوا ہیں آپ

جبکہ عیسیٰ ہی مرا مجھ سے خفا ہو جائے
حالِ دل کیوں نہ ہو ایں جان پر ابتر میرا

خاک صحرا کی یہ چھانی کہ ہوا کام تمام
عین خشکی میں ہوا غرق سفینہ اپنا

خواہشِ زر نہیں عالم مرے دل کو واللہ
سکۂ داغ سے مملو ہے خزینا اپنا

ذیل کے ان اشعار کو دیکھئے کہ تشبیہات کا استعمال کس خوبی سے ہوا ہے، عمدہ تشبیہات کا التزام کلام کی خوبصورتی کو دوبالا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔کوئی بھی تشبیہ پر پیچ یا گنجلک نہیں ہے بلکہ قاری کی دسترس میں ہے:

محوِ نظارۂ نگار ہوا
تیر مژگاں جگر کے پار ہوا

صاف دو ٹکرے ہو گیا وہ دل
تیغ ابرو کا جس پہ وار ہوا

گیسوئے خمدار اس کی رخ پہ بل کھانے لگا
سینۂ عشاق پر اک سانپ لہرانے لگا

گرمیٔ عشق سے نہ پائی نجات
جلتے جلتے جگر کباب ہوا

عالم کی بیاضِ عشاق اپنے محتویات کے اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔انیسویں صدی کی شاعرات میں عالم کا کلام اہمیت کا حامل ہے۔ان کی شاعری میں کلاسکی رنگ وآہنگ ہے۔لیکن اس زمانے کی روش بھی یہی تھی۔ان کی شاعری میں احساسات جذبات قدم قدم پر بھرے پڑے ہیں۔ تاہم یہ بھی ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب شاعرات اپنے نام کو مخفی رکھتی تھیں، یہاں ایک خاتون اپنے جذبے کا برملا اظہار بھی کرتی نظر آتی ہے۔عالم کا کلام اس بات کا بین ثبوت فراہم کرتا ہے کہ انیسویں صدی میں شاعرات بھی اپنے جذبات کا برملا اظہار کرنے سے قاصر نہ تھیں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ انھوں نے تانیثیت کو ایک فیشن کے طور پر نہیں برتا۔

❑❑❑

Md. Shahid
24B, Abdul Halim Lane
Kolkata-700016 (West Bengal)

روبینہ

طلبا اور ہم نصابی سرگرمیاں

بقول معروف یونانی فلسفی و سائنسدان ارسطو "انسان ایک سماجی جانور ہے"اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی انسان بغیر سماج کے زندہ نہیں رہ سکتا۔اسے زندگی کے ہر موڑ پر سماج کی ضرورت ہوتی ہے اور انسان کو سماج سے جوڑنے کا اہم ذریعہ تعلیم ہے۔یہی نہیں سماجی اور معاشرتی ترقی کے لیے تعلیم کا کردار بے حد اہم ہے تعلیم بہت ہی طاقتور اور روشن انسانی مہم ہوتی ہے۔سماجی ترقی کے لیے بے حد اہم ہوتی ہے۔تعلیم سماجی تبدیلی کا ایک ذریعہ ہے طلبا اپنے دور بلوغیت میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے مختلف مراحل طے کرتے ہیں اور بالآخر وہ زندگی کے طور طریقہ کے لیے تیار ہوتے ہیں۔لہٰذا تعلیم ایک ایسا لائحہ عمل ہے جو کہ سماجی موروثیت اور ثقافت میں منتقل ہوتا ہے۔تعلیم کسی بھی انفرادی شخص کو کسی پھول کی طرح کھلاتی ہے جس کی خوشبو سے سارا ماحول معطر ہو جاتا ہے۔

تعلیم ایک ایسا عمل ہے جو فرد کی صلاحیتوں و قابلیتوں کو فروغ دیتا ہے اور موجودہ تعلیمی نظام کا اہم مقصد فرد واحد میں تمام خوبیوں کو ایک متوازن طریقہ سے ترقی دینا ہے۔ اس حقیقت کے بارے میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے کہ 'تعلیم' کو طلباء کی شخصیت کی ہمہ جہت ترقی پر زور دینا چاہیے تاکہ انہیں بدلتے سماج کا مؤثر ممبر بنایا جاسکے . تعلیم کے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تعلیمی مضامین کے علاوہ، اسکولوں میں مختلف قسم کی دیگر سرگرمیوں کو مناسب طریقے سے منظم کیا جائے۔سرگرمیوں میں نصابی اور ہم نصابی سرگرمیاں شامل ہیں اور موجودہ تعلیمی نظام کا مقصد فرد واحد میں تمام خوبیوں کو ایک متوازن طریقہ سے پروان چڑھانا پھر بھی یہ کئی اہم نکات کو فرد واحد میں پیدا کرنے سے قاصر ہے کیوں کہ اصل توجہ نشانات، درجے اور فیصد وغیرہ کے حصول پر دی جارہی ہے۔تاہم، حالیہ عرصہ میں دنیا بھر میں یہ بات سمجھی گئی کہ نشانات، فیصد اور درجوں کا حصول دراصل 'تعلیمی طریقہ کا ایک شعبدہ' ہے۔یہ مشکل ہی سے طلبہ کی ترقی کے کسی ایک پہلو کو بھی اجاگر کرنے میں ناکام رہا جسے تعلیمی ترقی یا زائد از نصابی سرگرمیوں میں طلبہ کی شخصیت میں بہتری کے طور پر دیکھا جاسکے۔ایک اور اہم پہلو جسے غیر تعلیمی ترقی یا زائد از نصابی ترقی کا نام دیا گیا ہے وہ طلبہ کی کلی ترقی کا سب سے اہم حصہ ہے۔لہٰذا ایسا سمجھا گیا اور تصور کیا گیا کہ کسی بھی فرد کی تعلیمی یا نصابی ترقی کے ساتھ ہی اس کی غیر تعلیمی یا غیر نصابی ترقی جس میں تعلیمی، جسمانی، ذہنی، سماجی، مذہبی، روحانی ترقی کو کسی بھی فرد کی" کلی ترقی " کا نام دیا گیا۔تعلیم کے کلی ہدف کو لازمی طور پر طلبہ کی کلی فروغ پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔لہٰذا نصاب میں لازمی طور پر ان تمام پہلوؤں کو تعلیمی نظام میں شامل کرنا ہوگا اور ہم نصابی سرگرمیوں کو جسے اسکولوں میں روبہ عمل لانے کی ضرورت پر زور دیا جانا چاہیے۔

سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن (53-1952) کے مطابق:-"تعلیمی فکرونظر کے لحاظ سے نصاب سے مراد علمی مضامین ہی نہیں جو کہ روایتی طریقوں پر اسکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں بلکہ اسکول کے مختلف مشاغل جو کمرہ جماعت، لائبریری تجربہ گاہ، ورکشاپ کھیل کا میدان نیز اساتذہ اور طلبا کے درمیان پیش آنے والی غیر رسمی گفتگو کے نتیجے میں حاصل ہونے والے تجربات ہیں۔"

سماج کو ایسے افراد کی ضرورت ہے جو ذہنی اور جسمانی طور پر صحت مند ہوں اور ساتھ ہی ان میں تخلیقی صلاحیتیں، سخت محنت اور ایمانداری ہو۔

ایسی صلاحیتوں کو تربیت اور مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ کتابیں تنہا ایسی صلاحیتیں پیدا نہیں کرسکتیں۔ ایسے اوصاف ہم نصابی سرگرمیوں سے پیدا کیے جاسکتے ہیں لہٰذا ہم نصابی سرگرمیاں، ایک تسلسل کے ساتھ اسکول کے پروگرام کا حصہ ہیں جو طلبہ کی کلی طور پر ترقی میں معاون ثابت ہوتی ہے جو کہ امتحان میں شامل مضامین سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔ ہم نصابی سرگرمیاں ذہن اور شخصیت کی نشوونما میں مددگار ثابت ہوتی ہیں جیسا کہ ذہانت میں ترقی، جذبات پر قابو، سماجی ترقی، اخلاقی ترقی اور جمالیاتی ترقی۔ تخلیقی صلاحیت، جوش ولولہ اور طاقت سے بھرپور، مثبت سوچ کچھ ایسی ہی صلاحیتیں شخصیت سازی کے لیے ضروری ہیں جو کہ ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ ہم نصابی سرگرمیاں دراصل نصاب کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ یہ سرگرمیاں ہمہ جہت ترقی کے لیے شخصیت سازی کے لیے ضروری ہیں۔ قبل ازیں ایسی سرگرمیاں جیسے کہ کھیل، بھاگ دوڑ، گھومنا پھرنا، پکنک منانا، گلوکاری، مصوری وغیرہ کو نصاب میں شامل نہیں کیا گیا تھا اور اسے غیر نصابی سرگرمیوں کے تحت لیا جاتا تھا۔ تاہم اب اس کی افادیت کے پیش نظر جدید ماہرین تعلیم نے اسے اہم قرار دیا۔ لہٰذا ان سرگرمیوں کو تعلیمی پروگرام میں اسکول میں شامل کرتے ہوئے ہم نصابی سرگرمیاں قرار دیا گیا۔

سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن کے مطابق یہ سرگرمیاں نصاب کا جزو لاینفک ہیں جتنا کہ نصابی سرگرمیاں۔ مختلف اقسام کی ہم نصابی سرگرمیاں ہیں ان مختلف مشاغل کو ہم درج ذیل زمروں میں درجہ بندی کرسکتے ہیں۔

جسمانی نشوونما کے مشاغل
تعلیمی وادبی نشوونما کے مشاغل
جمالیاتی اور ثقافتی نشوونما کے مشاغل
فاصل اوقات کے استعمال کے مشاغل
حرکی مہارتوں کی نشوونما کے مشاغل
تفریحی مشاغل
سماجی نشوونما کے مشاغل
سماجی فلاح وبہبود کے مشاغل
ہمہ مقصدی مشاغل
اور دیگر مشاغل

ہم نصابی سرگرمیوں کے معنی کئی خصوصیات اور نکات ہوتے ہیں۔ کلی طور پر کسی بھی طلبا کی ترقی کے لیے نصاب ہی واحد راستہ نہیں ہوتا۔ کلی طور پر ترقی کے علاوہ بچوں کی شخصیت سازی کے لیے کلاس روم کی تعلیم کو ہم نصابی سرگرمیوں سے حوصلہ افزائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کلاس کے باہر کی سرگرمیاں زندگی کے دائرہ کار پر اثر انداز ہوتی ہیں جو ذہانت، جذبات، سماجی، اخلاقی، ثقافتی اور جمالیاتی ترقی وغیرہ ہوتی ہے۔ ہم نصابی سرگرمیوں کے معنی یہ ہیں کہ ایسی ذہنی کاوشوں پر توجہ کی جائے جو ذہنی ترقی کے لیے مددگار ثابت ہوں۔

نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کو ایک دوسرے کے لیے اعزازی قرار دیا گیا ہے۔ ''سکنڈری ایجوکیشن کمیشن'' کے مطابق جس میں ہم نصابی سرگرمیوں کی رپورٹ پر دیا گیا۔ یہ اسکول کی سرگرمیوں کا ایک اٹوٹ حصہ ہے جبکہ نصابی کام اور اس کی مناسب اور منظم ترتیب کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے باریک بینی سے دیکھا جائے کہ آیا اس کا صحیح ڈھنگ سے انعقاد عمل میں آرہا ہے یا نہیں یہ بہت ہی قیمتیر تاؤ اور صلاحیتوں کے لیے مددگار ہے۔'' اس لیے انھیں مناسب طور پر منظم کرنے کے لیے اتنی ہی فکر اور احتیاط کی جانی چاہیے۔ اگر ان کا انعقاد مناسب طور پر کیا جائے تو وہ طلباء میں قابل قدر رویوں اور صلاحیتوں کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اسکول میں قابل اور باصلاحیت اساتذہ مختلف قسم کی ہم نصابی سرگرمیوں کا انعقاد کرسکتے ہیں۔

زمانہ قدیم کے ہندوستانی صحیفوں میں جیسا کہ ویداس، اوپنیشد، یوگا وشیتا تھا، مہابھارت، رامائن، یہ تمام ہمیں گوروکل اور آشرم کے نظام کے بارے میں بتاتے ہیں۔ ہم نصابی سرگرمیوں میں آشرم کی صفائی، لکڑیاں اکٹھا کرنا، گائے سے دودھ دوہنا، کشتی، تیراندازی، کپڑوں کی رنگ سازی، پکوان، گلوکاری، کھیل کود، جنگی تربیت وغیرہ شامل تھیں جو بہت ہی عام تھیں۔ یونان کے اسپارٹہ تہذیب میں جنگی تربیت اور سماجی خدمت ایک عام بات تھی۔ کم یا زیادہ یہی سب رومن تہذیب میں بھی تھیں۔ لہٰذا، ہم نصابی سرگرمیاں جدید تعلیمی نظام میں بطور نصاب کے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہم نصابی سرگرمیوں کی روایتیں ہندوستانی زمانہ قدیم کے اسکولوں سے ملتی ہیں گروکل اور مذہبی مقامات پر بھی ملتی ہیں۔ تمام ہندوستانی صحیفوں جیسا کہ مہابھارت، رامائن، ویدا، اوپنیشد وغیرہ میں زائد از نصابی سرگرمیوں کے بارے میں لکھا پایا گیا۔ زمانہ قدیم میں سادہ ہم نصابی سرگرمیوں کو اسکول میں منعقد کیا جاتا تھا جس میں کشتی، پکوان، گلوکاری، کھیل کود، جادوئی کھیل وغیرہ شامل تھے۔

مثبت سوچ وفکر بچہ کے اندر سماجی خدمات کے جذبات کو ابھارتی ہے اور اسے سماج کا ایک ذمہ دار فرد بناتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک ایسا بچہ جس میں سماجیت کا فقدان ہو وہ سماج کو سمجھنے اور اس کی اپنی ذمہ داری

کو پہچاننے میں کمزور ہوتا ہے اور ایسا بچہ سماج اور دیگر کسی بھی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے میں پیچھے رہتا ہے۔

''ہم نصابی سرگرمیاں سماجی پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں'' سماجی تعاون ایک اہم ترین ضرورت ہے۔ یہ مشکل ہے کہ اسے کسی مضمون یا زبان کے ذریعہ سکھایا جائے جیسا کہ ریاضی، سائنس، معاشیات یا پھر مینجمنٹ یا سماجی علوم وغیرہ۔ گروپ کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے دوران طلبہ اچھے اخلاق اور ساتھ ہی جذبہ تعاون کو سیکھتے ہیں۔ کسی کلب کی ممبر شپ، طلبہ کی کونسل، ڈرامہ میں حصہ لینا یا پھر ا متعلقہ ٹیم میں تعاون کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ تعلقات کی تائید یا سراہنے سے کسی بھی سماجی گروپ میں کسی انفرادی شخص پر کیا اثر پڑتا ہے؟ یہ طلبہ سیکھتے ہیں۔ ٹیم کے ذریعہ، طلبہ سماجی تعاون سیکھتے ہیں۔ ان میں گروپ کے جوش کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ ''ہم'' کا احساس، پیدا ہوتا ہے۔ اتحاد اور تعاون کی قابلیت پیدا ہوتی ہے اور ہم نصابی سرگرمیاں طلبہ کو بطور گروپ، ٹیم کے کام کرنے کا موقع دیتی ہیں اور ان کی سماجی صلاحیتوں جن میں تعاون، ایک دوسرے کی مدد اور برابری جیسی خوبیاں پیدا کرتی ہے۔ یہ طلبہ کو ورک گروپس میں سیکھنا اور اپنی ٹیم کو بہتر کام دینا سکھاتی ہیں۔

1980 کے مطابق بچپن سے بلوغت کا دور سماجی ملنساری کو پروان چڑھانے کے لیے اہم ہے اور یہ دور اسکول دور (Schooling Period) کہلاتا ہے۔ طلبہ میں مختلف ہم نصابی سرگرمیوں کے ذریعہ سماجی ملنساری کو پروان چڑھایا جاسکتا ہے۔ جیسے سماجی اسٹڈی سرکل، سماجی خدمات جو کہ خصوصی حالات جیسا کہ تقاریب پیشہ وارانہ، ثقافتی پروگرامس، اسمبلی، فرسٹ ایڈ اور ریڈ کراس سماجی سروے، سماج کے ساتھ تعاون، اسکاؤٹنگ اور گائیڈنگ، این سی سی، این ایس ایس، کھیل اور بھاگ دوڑ، کالج کونسل کی سرگرمیاں، خصوصی تقاریب کا جشن، اسکول کے مختلف دنوں کا جشن وغیرہ۔ اسکول پارلیمنٹ کے انتخابات، کوآپریٹیو اسٹورز، صفائی کا عمل، ایڈز کے تعلق سے شعور آگہی پروگرام، نشہ، شراب اور دیگر کے نتائج پر پروگرام، عالمی ماحولیاتی ڈے پر پروگرام، ماحول کے تحفظ پر پروگرام وغیرہ۔ یہ سرگرمیاں سماجی برتاؤ جس میں گروپ کے جذبات، تعاون، احساس ذمہ داری، اخلاص، وفاداری اور آپسی سمجھ بوجھ جیسے اچھے اوصاف پیدا کرتی ہیں۔ یہ سرگرمیاں کسی بھی فرد کے سماج اور اسکول کے درمیان تعلق کو سمجھنے میں مددگار ہوتی ہیں۔ یہاں یہ نوٹ کیا جانا لازمی ہے کہ یہ تمام سرگرمیاں کسی ایک مقصد کے تحت نہیں کی جاتیں بلکہ یہ کئی مقصد کے تحت ہوتی ہیں جو کہ کسی بھی فرد کی شخصیت کی ہمہ جہت ترقی میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

طلبا کی سماجی ملنساری پر ہم نصابی سرگرمیوں کا اثر: ہم نصابی سرگرمیوں کا طلباء کی سماجی ملنساری پر اثر دیکھنے کے لیے محققہ نے ثانوی اسکول کے طلبا پر تحقیقی کام کو انجام دیا۔ اس تحقیقی کام کا مقصد طلبا کو ہم نصابی سرگرمیوں میں شریک کرنا اور طلباء کی سماجی ملنساری پر ہم نصابی سرگرمیوں میں شرکت کے اثرات کو جاننا تھا۔ اس تحقیق سے یہ نتائج سامنے آئے کہ طلبا کی سماجی ملنساری پر ہم نصابی سرگرمیوں میں شرکت کے مثبت اثرات ہیں۔ معطیات کو حاصل کر کے ان کا تجزیہ کیا گیا جس میں یہ بات عیاں ہوئی کہ طلبا میں سماجی ملنساری کی سطح میں ہم نصابی سرگرمیوں میں شرکت سے قبل اور بعد ازیں واضح فرق ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہم نصابی سرگرمیاں طلبا کی سماجی ملنساری کو فروغ دینے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

ثانوی اسکول طلبا پر تحقیقی مطالعہ کا ماخذ یہ ہے کہ ہم نصابی سرگرمیاں طلبا میں سماجی ملنساری وصلاحیتوں کو بڑھانے میں مددگار و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ تحقیق کے نتائج یہ بھی بتاتے ہیں کہ اسکول کی سرگرمیاں اور سماجی ملنساری میں ایک اشتراک ہیں اور ایسے طلبا سماج کے لیے مثبت رویہ رکھتے ہیں۔ ثانوی اسکول کے طلبا میں ہم نصابی سرگرمیوں کی اہمیت اور شرکت کے مثبت اثرات ہے اور طلبا میں ہم نصابی سرگرمیوں کی اہمیت اور شرکت پر زور دینے کی بہت ضرورت ہے . ہم نصابی سرگرمیاں طلبا کی شخصیت کی ہمہ جہت ترقی کے لیے بہت موقع فراہم کرتی ہے۔ طلبا کو آئندہ زندگی کے لیے تیار کرنے کے لیے ہم نصابی سرگرمیوں کا انعقاد انتہائی ضروری تسلیم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا تمام سیکنڈری اسکولوں کو چاہیے کہ مختلف قسم کی ہم نصابی سرگرمیوں کا انعقاد کرے۔ ہم اسکولوں میں جسمانی علمی، ادبی، جمالیاتی، ثقافتی، حرکی، تفریحی اور سرگرمیوں کا اہتمام اور انعقاد کر کے طلبا کو آئندہ زندگی کے لیے مکمل طور پر تیار کر سکتے ہیں۔ اساتذہ کو چاہیے کے ہم نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے طلبا کی حوصلہ افزائی کریں اور طالب علموں کی شرکت کو یقینی بنائیں جو طلبا کی پوشیدہ صلاحیتوں اور خوبیوں کو اجاگر کرتی ہیں اور یہاں اشد ضرورت ہے کہ جو اولیائے طلبا ان سرگرمیوں کو اوقات کی خرابی سمجھتے ہیں ان اولیائے طلباء کو چاہیے کہ ان سرگرمیوں کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے وہ اپنے بچوں کو ان سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے حوصلہ افزائی کریں۔ اسکولوں میں ہونے والی مختلف ہم نصابی سرگرمیوں میں اولیائے طلبا اپنی دلچسپی کا اظہار کریں تاکہ طلباء ان سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

کتابیات

عمیر منظر، اردو زبان کی تدریس اور اس کا طریقہ کار، شپرا پبلیکیشنز، دہلی

پروفیسر محمد شریف خان، جدید تعلیمی نفسیات، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2008

محی الدین بچھ، جدید تدریس اردو، گلشن پبلیکیشنز، شرینگر 1998

Filiz keser, hanife akar, ali yildirim, j. "The role of extracurricular activities in activecitizenship education" curriculum studies, 2011, 1–29, first Article.

Gilman, R. (2001) The relationship between life satisfaction, social interest,andfrequency of extra-curricular activities among adolescent students. Journal of Youth andAdolescence, Vol.30, Pp. 749-767.

Sidiqui Qasim Mohd., 2006, Usul-E-Tadress, Educational Book House,Aligarh.

http://www.iiste.org

http://www.nationalforum.com

http://www.educationworld.com/_curr/.shtml

http://www.google.com/co curricular activities

http://www.google.scholar.com/ extra-curricular activities

□□□

Rubeena

Assistant Professor

H.No: 9-4-131/1/N/15

First Floor,Neeraja Colony

Tolichowki, Hyderabad-500008 (T.S)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کار کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.............................. بتاریخ..............................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/100 روپے IFSC: SYNB0009009، A/C: 90092010045326

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

عائشہ شفیق

قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں ناسٹلجیا

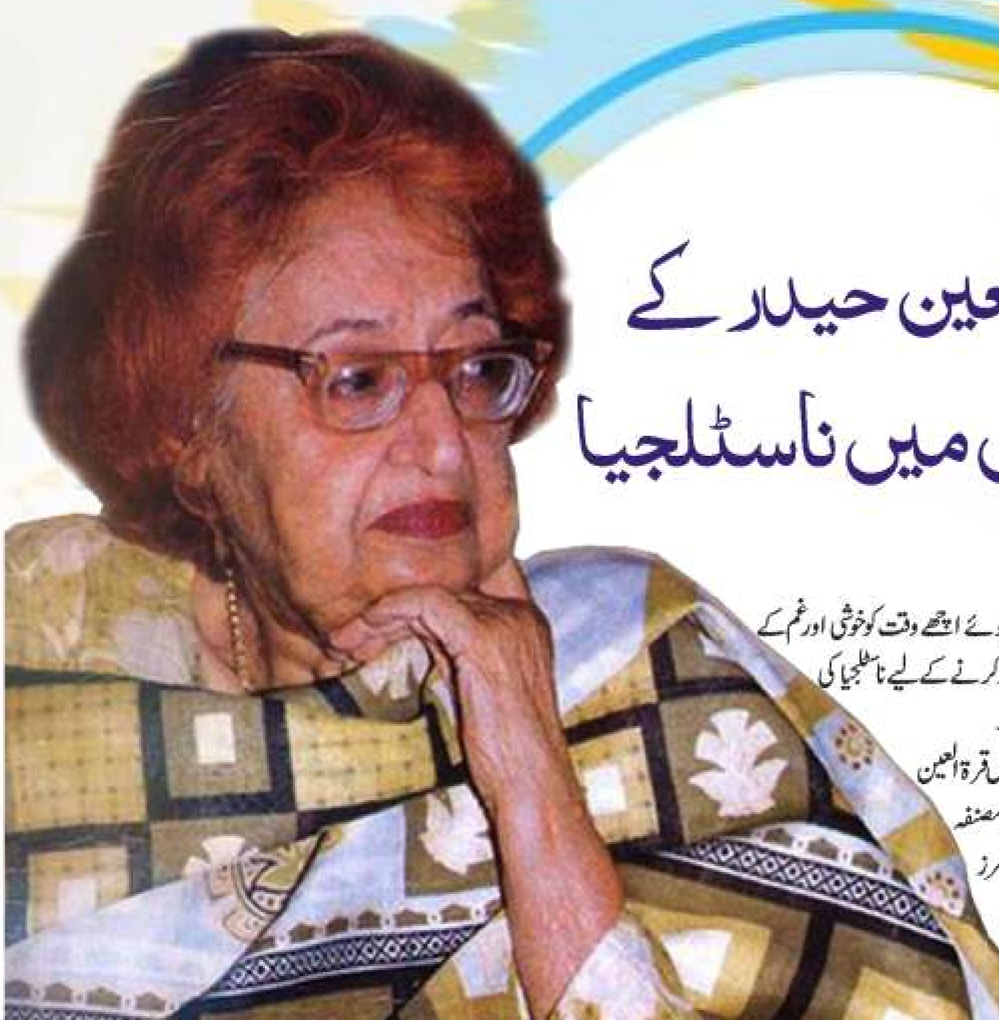

ماضی میں گزارے ہوئے اچھے وقت کو خوشی اور غم کے ملے جلے احساس کے ساتھ یاد کرنے کے لیے ناسٹلجیا کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

ہمارے یہاں اردو ادب میں قرۃ العین حیدر اس اعتبار سے ایک منفرد مصنفہ ہیں کہ وہ روایتی اور کلاسیکی طرز سے جذباتی ربط کے باوجود نئی جہات، نئی وسعتوں اور نئی راہوں کی سمت گامزن رہی ہیں اور اپنے بیان کے لیے انھوں نے نئی وسعتوں کا عملی ثبوت پیش کیا۔ جس کی ایک مثال ناسٹلجیا کا بیان بھی ہے۔ جواُن کی نگارشات میں جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ جس کی طرف پروفیسر سیدہ جعفر اپنے ایک مضمون میں یوں اشارہ کرتی ہیں:

''قرۃ العین حیدر کے افسانوں اور ناولوں میں ناسٹلجیا کی جھلک نظر آتی ہے اور ماضی کے دریچے سے یادوں کی آہٹیں سنائی دیتی ہیں۔ ماضی کی بازیافت سے لطف اندوز ہونے کا رجحان ان کی تحریروں پر کہیں کہیں غالب آگیا ہے۔''

(قرۃ العین حیدر کے ناولوں کی انفرادیت، پروفیسر سیدہ جعفر، ایوان اردو، جنوری 2008، ص66)

اگر دیکھا جائے تو قرۃ العین حیدر کے دو افسانوی مجموعوں ''شیشے کے گھر'' اور ''پت جھڑ کی آواز'' کے کم و بیش تمام افسانوں میں تقسیم سے قبل اور بعد کی ہندوستانی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں کے حوالے ملتے ہیں، اور ان دونوں مجموعوں کے تمام کردار کسی نہ کسی اعتبار سے ہجرت اور ناسٹلجیا کا شکار نظر آتے ہیں۔ ان تمام کہانیوں کے کردار دو طرح کی ہجرتوں کی وجہ سے ناسٹلجیا سے متاثر نظر آتے ہیں۔ پہلی کسی زمین کو ترک کر کے دوسری زمین میں منتقل ہونے کی وجہ سے دوسرے معاشرے میں خود کو اکیلا تصور کر کے روحانی خلا میں مبتلا ہونے والی ہجرت کی وجہ سے۔

میرے اس مضمون میں قرۃ العین حیدر کے صرف ان کرداروں پر روشنی ڈالی گئی ہے جن پر ناسٹلجیا کا اثر دیکھا جاسکتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے افسانے ''برف باری سے پہلے'' کا سب سے اہم کردار ''بوبی ممتاز'' ہے۔ جس کے گرد پورا افسانہ گھومتا ہے۔ یہ کردار تقسیم ہند کے بعد مسوری سے پاکستان کے کوئٹا چلا جاتا ہے اور وہیں رہنے لگتا ہے مگر اس کا دل کوئٹا میں نہیں لگتا اور وہ ہندوستان میں گزارے ہوئے دنوں کو وقتاً فوقتاً

یادکرتا رہتا ہے۔بوبی ممتاز کو پاکستان میں رہتے ہوئے چھ سال گزر چکے ہیں۔وہ جس گھر میں رہتا ہے اس گھر کے مالک اپنی بیٹی سعیدہ سے اس کی شادی کرنا چاہتا ہے جو بوبی کو بالکل ناپسند ہے۔ بوبی ایک دن سعیدہ کے گھر میں بیٹھا ہوتا ہے کہ ٹھنڈ کی وجہ سے اسے اپنے پرانے دن جو اس نے ہندوستان میں اپنے دوستوں کے ساتھ گزارے ہیں یاد آجاتے ہیں۔

''وہ رات بالکل ایسی تھی اندھیری اور خاموش۔ 9 ستمبر 43 کی وہ رات جو اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ مسوری کے وائلڈ روز میں آخری بار گزاری تھی۔کوئنی اور وجاہت کا وائلڈ روز جب وہ سب وائلڈ روز کے خوبصورت لاؤنج میں آگ کے پاس بیٹھے تھے اور کسی کو پتہ نہیں تھا کہ وہ آخری مرتبہ یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔لیکن وہ رات بھی پلک جھپکتے میں گزر گئی تھی۔وقت اسی طرح گزرتا چلا جاتا ہے۔''

(آئینۂ جہاں، جلد اول، مرتب جمیل اختر، برف باری سے پہلے، ص373)

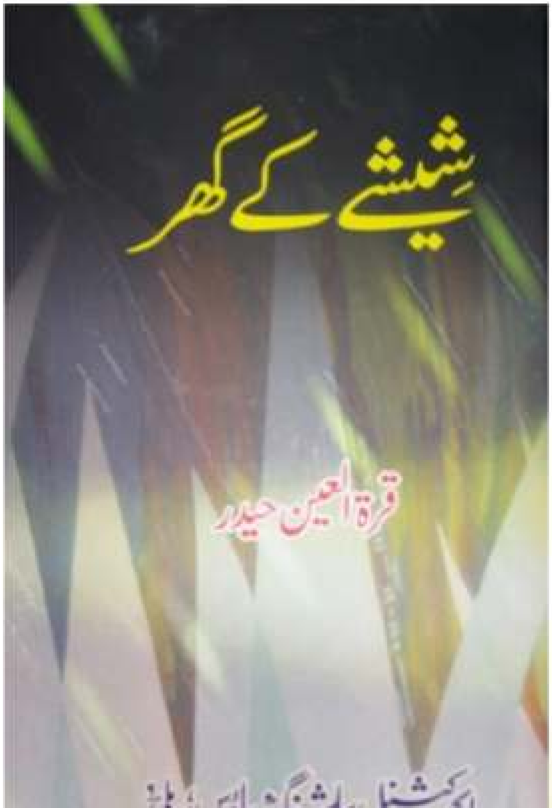

اس کے بعد وہ صاحب خانہ کے گھر سے کلب کی طرف روانہ ہو جاتا ہے اور کلب کے ایک تاریک کمرے میں بیٹھ کر اپنے دوستوں کو یاد کرنے لگتا ہے:

''بوبی۔ہاں کوئنی بی بی۔تم کہاں ہو۔ میں نے تمھاری آواز سنی ہے۔ابھی تم اور لو کھلکھلا کر ہنستی تھیں۔لیکن وہاں لو بھی نہیں تھی۔وجاہت بھی نہیں تھا۔فریڈ بھی نہیں تھا۔کوئنی بی بی اس نے چپکے سے دہرایا۔آٹھ بچپن۔اس کی نظر گھڑی پر پڑ گئی۔ وہ اس وقت سینکڑوں ہزاروں میل دور نشر گاہ کے اسٹوڈیو میں بیٹھی اپنے سامنے رکھے ہوئے بلیٹن کے ٹھیٹ سنسکرت الفاظ نگلنے کی کوشش میں مصروف ہوگی۔اور موسم کی رپورٹ سنا رہی ہوگی۔ گھڑی اپنی متوازن یکسانیت کے ساتھ ٹک ٹک کرتی رہی۔ وجاہت بھائی۔تم اس وقت کیا کر رہے ہو۔اور فریڈ اور....اور....انیس۔''

(آئینۂ جہاں جلد اول۔مرتب:جمیل اختر۔برف باری سے پہلے،ص377)

بوبی ممتاز اپنے دوستوں فریڈ۔لو۔کوئنی۔وجاہت۔وغیرہ سے پہلی بار 1942 یعنی تقسیم ہند سے قبل ملا تھا۔ یہ سارے دوست ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں سیر و تفریح کے لیے مسوری جایا کرتے تھے لہٰذا بوبی بھی ان کے ساتھ ہر سال مسوری جانے لگتا ہے۔ جہاں اس کی ملاقات ہِگر ڈ سے ہوئی اور وہ اس کو دل ہی دل میں چاہنے لگتا ہے۔مگر وہ انیس نام کے ایک رئیس اور کپتان کے ساتھ اکثر نظر آتی ہے۔

بوبی ممتاز وہیں بیٹھے بیٹھے آگے سوچتا ہے کہ سگرڈ کے گھر سے انیس کے چلے جانے کے بعد وہ کس طرح پہلی بار سگرڈ کے گھر پہنچا تھا جو اس وقت بستر پر پڑی رو رہی تھی اور اس سے سارے واقعے کی حقیقت کے بارے میں پوچھا تھا کہ کیا وہ کپتان کے ساتھ انیس کو چھوڑ کر کہیں جا رہی ہے تو سگرڈ نے کہا تھا کہ ہاں وہ کپتان کے ساتھ جا رہی ہے تو اس بات پر میں نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ کپتان کے ساتھ نہ جائے بلکہ میرے ساتھ پاکستان چلے مگر وہ میری بات نہیں مانی تھی۔بابی ممتاز پھر آگے سوچتا ہے۔

یہ واقعہ 9 ستمبر 1947 کا تھا جس وقت ملک آزاد ہو چکا تھا اور تقسیم کا سانحہ بھی پیش آچکا تھا۔اور ہر طرف قتل و غارت گری کا ماحول گرم تھا۔اس رات جب وہ سارے دوست مسوری میں تھے یہاں پر بھی فساد پھوٹ پڑا اور وہ سب جلدی جلدی صبح ہونے تک مسوری چھوڑ کر دہرہ دون چلے گئے اور وہ پاکستان چلا آیا۔

اس افسانے میں بوبی ممتاز کا کردار جس کے گرد یہ افسانہ گھومتا ہے ایک ایسا مہاجر کردار ہے جو پاکستان میں چھ سال گزارنے کے بعد بھی اپنے ملک اور اپنے دوستوں کو اسی طرح یاد کرتا ہے جیسے کل ہی ہجرت

کر کے پاکستان آیا ہو۔

ہندوستان کے سارے واقعات اس کے ذہن میں ایک فلم کی طرح موجود ہیں جو تنہا ہونے پر اس کے دل و دماغ میں ناسٹلجیا کی طرح موجود رہتے ہیں اور اس کو وقتاً فوقتاً افسردہ کرتے رہتے ہیں۔

قرۃ العین کا دوسرا کردار 'کارمن' نام کی ایک لڑکی ہے۔ جس کے نام پر انھوں نے افسانہ 'کارمن' لکھا ہے۔ یہ لڑکی بھی ناسٹلجیا سے متاثر نظر آتی ہے۔ کارمن فلپائن کی دارالسلطنت منیلا کی رہنے والی ہے جو ایک دفتر میں ملازم ہے اور ساتھ میں کیمسٹری میں ریسرچ بھی کرتی ہے ۔کارمن ''نک'' نام کے ایک لڑکے سے محبت کرتی ہے اور وہ لڑکا بھی اس کو بہت چاہتا ہے ان دونوں کی ملاقات دس سال پرانی ہے۔

''نک سے میری ملاقات آج سے دس سال قبل ایک فیسٹا (Fiesta) میں ہوئی۔''

(کارمن۔قرۃ العین حیدر۔مجموعہ ''پت جھڑ کی آواز'' ص 182)

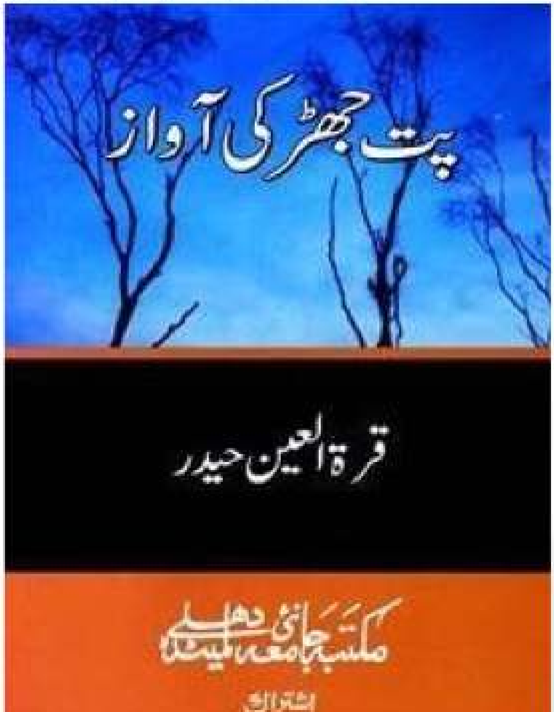

مگر جس وقت کارمن اور نک کے تعلقات بڑھنے شروع ہوتے ہیں انہی دنوں جنگ شروع ہو جاتی ہے اور اس جنگ میں بمباری کے سبب کارمن کا گھر جل کر راکھ ہو جاتا ہے اور اس کی ماں اور دو بھائی مارے جاتے ہیں۔بس وہ اور اس کے والد صاحب زندہ رہ جاتے ہیں۔

''جنگ کے زمانے میں بمباری سے ہمارا چھوٹا سا مکان جل کر راکھ ہو گیا اور میری ماں اور دونوں بھائی مارے گئے۔ صرف میں (کارمن) اور میرے بابا زندہ رہ گئے۔''

(کارمن۔قرۃ العین حیدر۔مجموعہ پت جھڑ کی آواز، ص 182)

لیکن جنگ کے چند روز بعد ہی کارمن کے والد کو ٹی۔بی ہو جاتی ہے اور وہ ان کے علاج کے لیے شہر چھوڑ کر ایک جزیرے میں ہجرت کر جاتی ہے جو بہت دور ہوتا ہے۔ یہاں وہ اپنے والد کو جس سینیٹوریم میں داخل کراتی ہے اسی میں نوکری کرنے لگتی ہے۔ ان دنوں وہ جب بھی منیلا جو فلپائن کا دارالسلطنت تھا آتی تو نک سے اس کی ملاقات ضرور ہوتی ہے۔ نک اس سے شادی کرنے کے لیے کہتا ہے مگر کارمن کو اپنے بابا کے علاج کی فکر ہوتی ہے اس لیے وہ اس سے شادی کر کے اپنے بابا سے الگ نہیں ہونا چاہتی ہے۔

اسی دوران نک کو ہارٹ اسپیشلائزیشن کے لیے امریکہ جانا پڑ جاتا ہے اور اس کے جانے کے بعد کارمن کے والد کا بھی انتقال ہو جاتا ہے اور وہ دوبارہ اپنے شہر میں واپس آ جاتی ہے اور ایک جگہ یوں گویا ہوتی ہے:

''تین سال ہوئے اس (نک) نے شادی پر اصرار کیا۔لیکن بابا کی حالت اتنی خراب تھی کہ میں (کارمن) ان کو مرتا چھوڑ کر یہاں نہ آ سکتی تھی۔ اسی زمانے میں نک کو باہر جانا پڑ گیا۔ جب بابا مر گئے تو میں یہاں آ گئی۔'' (کارمن۔ قرۃ العین حیدر۔ مجموعہ: پت جھڑ کی آواز، ص 182)

مگر کارمن کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ جس نک سے شادی کرنے کے خواب دیکھ رہی ہے اس نے ایک امریکن لڑکی سے شادی کر لی ہے اور اس کی ایک چھ مہینے کی لڑکی بھی ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔ کارمن کہانی میں یوں سوچتی ہے:

''ہوزے (نک) کی عمر تقریباً پینتیس سال کی رہی ہوگی۔ اپنی قومی گڑھت کی ہلکے آبی رنگ کی قمیص اور سفید۔ پتلون میں وہ خاصا وجیہہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اپنی نوعمر بیوی کو بے انتہا چاہتا تھا اور بچی پر عاشق تھا۔ زیادہ تر وہ اسی کی باتیں کرتا رہا۔''

(کارمن۔قرۃ العین حیدر۔مجموعہ: پت جھڑ کی آواز، ص 178)

اس کہانی میں کارمن نک سے اپنے پرانے تعلقات کی یاد کی وجہ

سے ناسٹلجیا میں گرفتار ہے۔

قرۃ العین حیدر کا ایک اور کردار تنویر فاطمہ ہے۔ یہ افسانہ ''پت جھڑ کی آواز'' کا مرکزی کردار ہے۔ جو بحالت مجبوری ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرتی ہے اور پورے افسانے میں وہ اپنے ساتھ ہندوستان میں گزرے ہوئے واقعات کو یاد کرتی رہتی ہے جو ناسٹلجیا کی ایک بہترین مثال ہے۔ ہجرت سے قبل وہ ایک آزاد خیال لڑکی ہوتی ہے جس کے کئی مردوں سے کافی گہرے تعلقات ہوتے ہیں۔ اس کے ان مردانہ دوستوں میں مذہب کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے اور ہندو مسلم سب سے اس کے مراسمات ہوتے ہیں وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ ہندوستان میں سیر و تفریح کے واقعے کو یاد کرتے ہوئے یوں گویا ہوتی ہے:

''اس کے بعد ہفتے تک میں نے خوب خوب سیریں اس کے ساتھ کیں۔ وہ میڈنز (ہوٹل) میں ٹھہرا ہوا تھا۔
اس ہفتے کے آخر تک میں میجر خوش وقت سنگھ کی مسٹریس بن چکی تھی۔''

''خوش وقت سنگھ مجھے مارتا بہت تھا۔ اور مجھ سے اتنی محبت کرتا تھا جو آج تک دنیا میں کسی مرد نے کسی عورت سے نہ کی ہوگی۔''

''اب کے سے جب وہ خوش وقت سنگھ دتی آیا تو اس نے اپنے ایک جگری دوست کو مجھے لینے کے لیے موٹر لے کر بھیجا۔ کیوں کہ وہ لکھنؤ سے لاہور جاتے ہوئے پالم پر چند گھنٹے کے لیے ٹھہرا تھا۔ یہ دوست دلی کے ایک بڑے مسلمان تاجر کا لڑکا تھا۔ لڑکا تو خیر نہیں کہنا چاہیے۔ اس وقت بھی وہ چالیس کے لپیٹے میں ہوگا۔ بیوی بچوں والا۔ تاڑ کا سا قد۔ بے حد غلط انگریزی بولتا تھا۔ کالا بدقطع۔ بالکل چڑیمار کی شکل۔ ہوش صفت خوش وقت اب کی مرتبہ دتی سے گیا تو پھر کبھی واپس نہ آیا کیوں کہ اب میں فاروق کی مسٹریس بن چکی تھی۔''

(پت جھڑ کی آواز۔ قرۃ العین حیدر، مجموعہ، پت جھڑ کی آواز، ص221)

مگر جب وہ پاکستان آتی ہے تو یہاں وہ ہمہ وقت حالات سے مصالحت کرتی ہے۔ وہاں کی آزاد زندگی وہ یہاں پاکستان میں نہیں گزار پاتی ہے اور اکثر اپنی گزشتہ زندگی کو یاد کرتی ہے:

''میں زندگی کی اس یک بیک تبدیلی سے اتنی ہکا بکا تھی کہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا سے کیا ہوگیا۔ کہاں غیر منقسم ہندوستان کی وہ بھرپور، دلچسپ رنگا رنگ دنیا، کہاں 48ء کے لاہور کا وہ تنگ و تاریک مکان۔ غریب الوطنی۔ اللہ اکبر ...میں نے کیسے کیسے دل دہلا دینے والے زمانے دیکھے ہیں۔''

(پت جھڑ کی آواز، قرۃ العین حیدر، مجموعہ پت جھڑ کی آواز، ص225)

تنویر فاطمہ کو اپنے وطن، اپنے دیس کی اس وقت اور زیادہ یاد آتی ہے جب اس کو پتہ چلتا ہے کہ اس کے والد اس دنیا میں نہیں رہے۔ یہاں تنویر چاہتی تو وہ پاکستان میں رہ کر بھی اچھی اور عیش و عشرت کی زندگی گزار سکتی تھی مگر ہجرت کے کرب اور ناسٹلجیا نے اس کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔ یہاں اس کے دل میں کچھ نیا کرنے، کچھ نیا پانے کی کبھی کوئی خواہش نہیں ہوتی ہے۔ بس قسمت سے جو اسے مل جاتا ہے اسی کو قبول کر لیتی ہے۔

اسی طرح کشوری جو افسانے 'جلاوطن' کی ایک اہم کردار ہے وہ تقسیم ہند کے بعد مجبوری کی حالت میں انگلستان ہجرت کر جاتی ہے لیکن اس کو اپنی جلاوطنی کا احساس ہمہ وقت رہتا ہے۔ وہ اکثر اس سوچ میں گم رہتی ہے کہ وہ اپنے بھائی کے بلانے کے باوجود پاکستان نہیں گئی اور ہندوستان کے آزاد سماج نے مسلمان ہونے کی وجہ سے اس کو قبول نہیں کیا لہٰذا وہ انگلستان چلی آتی ہے پر وہ کب تک یہاں رہے گی اور اگر کبھی یہاں سے جانا پڑا تو وہ کہاں جائے گی؟ کیوں کہ اب دونوں ہی زمینیں اس کو قبول نہیں کریں گی۔

''تم نے کبھی خیال کیا ہے کہ میں کہاں جاؤں گی میرا گھر اب کہاں ہے؟ کیا میں اور میری طرح دوسرے ہندوستانی مسلمان ایسے مضحکہ خیز اور قابلِ رحم کردار بننے کے مستحق تھے۔'' (جلاوطن، قرۃ العین حیدر، مجموعہ، پت جھڑ کی آواز، 91)

ان کرداروں کی مثالوں کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں میں ناسٹلجیا کا بیان نہایت ہی مہارت کے ساتھ کیا ہے اور اس ماہرانہ پیش کش کی وجہ کہیں نہ کہیں ان کا خود کچھ وقت کے لیے ہندوستان سے باہر ہجرت کر جانا بھی ہوسکتا ہے۔

□□□

Ayesha Shafeeq
C/o. Zafar Ahmad Siddiqui
Professor Deptt of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)

زلیخا بیگم چاند

راگھویندر راؤ جذب عالمپوری
اور اردو ترجمہ

ترجمہ کا فن کافی قدیم ہے۔ ترجمہ وہ چابی ہے جس کے ذریعہ دیگر زبانوں کے راز ہم پر کھلتے ہیں۔ ادب میں ترجمہ کی بڑی اہمیت ہے۔ ترجمہ ہی وہ ذریعہ ہے جس سے تمام علوم وفنون کے دریچے کھلتے ہیں تو وہیں ادب کے مشہور ومعروف شخصیات جیسے شیکسپیر، عمر خیام، مولانا رومی، سعدی شیرازی، ٹیگور، کالی داس، شری بسویشور کی عظمت و لیاقت کا اعتراف ترجموں کے ہی مرہون منت ہے۔

ترجمہ کا فن نہایت ہی مشکل امر ہے اور بڑا ہی مشقت طلب اور صبر آزما کام ہے۔ جس میں ایک زبان کے معنی ومفاہیم کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنا ہوتا ہے کہ اصل متن کی خوبی ترجمہ میں سما جائے۔ یہ کام صرف وہ ہی کر سکتا ہے جس کو دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ دونوں زبانوں کے فقرے، محاورے، ثقافتی وتہذیبی پس منظر سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ نثر کا ترجمہ نظم کے مقابلے میں آسان ہوتا ہے۔ نظم کا ترجمہ زیادہ مشکل اور بعض اوقات دقت طلب ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر جانسن نے کہا تھا کہ

"شاعری کا ترجمہ تو ہو ہی نہیں سکتا"

(فن ترجمہ نگاری، ص136)

یہ اس وقت اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جب جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اس میں شاعری کی وہ صنف موجود ہی نہیں جو اصل زبان میں پائی گئی ہے۔ اردو میں اب تک قومی وبین الاقوامی مختلف زبانوں سے ترجمے ہوئے ہیں۔ ملک کی زبانوں میں کنڑ بھی ایک زبان ہے جو اپنی الگ پہچان رکھتی ہے۔ اس زبان کی اپنی تاریخ ہے۔ لیکن اس زبان کا مزاج اردو زبان سے خاصہ مختلف ہے۔ اردو ادب کی طرح متنوع اصناف کنڑا زبان میں موجود نہیں ہیں پھر بھی کنڑا ادب قومی سطح پر سب سے زیادہ گیان پیٹھ انعام حاصل کرنے والی منفرد زبان ہے۔

کنڑا شاعری کے اصناف جیسے قدیم چمپو صنف، جنپد گیتے، دوپدی، تری پدی، شٹ پدی، منڈگے، وچن، کیرتن، غزل (آجکل اس اردو صنف نے کنڑا میں بھی جگہ بنا لی ہے) اردو کی رباعیات کو کنڑا میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ کنڑا زبان ترقی کی منزلیں طے کرتی نظر آ رہی ہے۔ مگر کنڑا کی صنف 'وچن' بارہویں صدی کی دین ہے۔ وچن کی ابتداء شری بسویشور نے کی۔ یہ صنف دنیا کی دیگر زبانوں کے لیے بالکل نئی ہے۔ وچن کے لغوی معنی قول یا حکایت کے ہیں۔ لفظ وچن اصل سنسکرت سے کنڑا میں آیا ہے۔ جس کے ذریعہ حکایات پیش کی جاتی ہیں یا نصیحت کی جاتی ہے اور بسویشور کے وچنوں کا ترجمہ کنڑا سے اردو میں سب سے پہلے راگھویندر راؤ جذب عالپوری نے کیا۔ اس لیے آپ کو کنڑا وچن کا اولین مترجم کہا جاتا ہے۔ محققین کا ماننا ہے کہ کنڑا سے اردو کے اولین ترجمہ نگار حمید الماس ہیں۔ لیکن راقمۃ الحروف کی تحقیق میں ان سے قبل کے مترجمین کے نام علم میں ہیں۔ ان میں راگھویندر راؤ جذب عالپوری، سید مجیب الرحمٰن، سید فضل الرحمٰن شعلہ۔ ان تینوں مترجمین نے وچنوں کے

ترجمے کنڑا سے اردو میں کیے ہیں۔ عمر کے لحاظ سے یہ تینوں حمید الماس سے بڑے ہیں۔ سید مجیب الرحمٰن نے اکا مہادیوی کے 150 وچنوں کو ہندی میں ترجمہ کیا۔ انھیں وچنوں کو آپ نے اردو میں منتقل کیا جو کتابی شکل میں شائع نہیں ہو پایا۔ اس کا بھی علم نہ ہو سکا کہ آپ نے کتنے وچنوں کو اردو میں ڈھالا ہے۔ آپ کے ترجمہ کیے گئے وچن کی ایک جھلک ہمیں ڈاکٹر ماجد داغی کے ایک مضمون میں ملتی ہے۔ ملاحظہ کریں:

''ڈاکٹر سید مجیب الرحمٰن نے اکا مہادیوی کے وچنوں کا فطری انداز میں منظوم ترجمہ کرتے ہوئے اس میں نئی روح پھونک دی ہے کہ قاری کو ترجمہ پڑھتے ہوئے اصل کا گمان ہوتا ہے۔''

(فن کے کچھ نئے تنقیدی زاویے، ص 57)

سید مجیب الرحمٰن کے بعد سید فضل الرحمٰن شعلہ نے شری بسویشور کے وچنوں کا اردو ترجمہ پیش کیا۔ آپ کے منظوم ترجمہ کے لیے مختلف اداراجات نے انعام سے نوازا۔ مگر ان تراجم کی کوئی کتابی شکل میسر نہیں ہے۔ لہٰذا کتابی صورت میں شائع ہونے والی کنڑا سے اردو کی اولین کتاب ''مہاتما بسویشور وچن امرت'' یعنی اقوال شیریں'' ہے۔ جس کے مترجم راگھویندر راؤ جذب عالم پوری ہیں۔ بسویشور کے 108 وچنوں کا ترجمہ جذب عالپوری نے سن 1967 میں پیش کیا اور یہ کتاب بسوا سمیتی بنگلور سے 1970 میں شائع کی گئی۔ وچنوں کے حوالے سے عموماً حمید الماس کو پہلا ترجمہ نگار بتایا گیا ہے۔ جب کے آپ کا ترجمہ 1975 میں منظر عام پر آیا۔ میری تحقیق ادب کے حوالے سے ہے تو جب میں نے مزید ادب (کنڑی سے اردو کے ترجمہ) کو ڈھونڈنا شروع کیا تو ایک اور نام میرے علم میں آیا کہ جنھوں نے 1949 میں اردو ادب کی مایہ ناز فکشن نگار، نقاد، افسانہ نگار، مترجم، ممتاز شیریں نے کنڑی افسانوں کا ترجمہ کیا ہے۔ اس طرح کنڑی سے اردو تراجم میں اولیت کا سہرہ ممتاز شیریں کے نام آتا ہے۔

راگھویندر راؤ جذب عالپوری نے 1894 کو رائچور کے ایک جاگیردارانہ گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ آپ کا نام راگھویندر راؤ تھا۔ آپ نے اپنا قلمی نام جذب عالپوری رکھ لیا۔ آپ کی تعلیم ابتدا سے ڈگری تک رائچور میں ہوئی اور ذریعہ تعلیم اردو رہا۔ اسی باعث آپ کو اردو سے شغف رہا۔ بی۔ اے کے بعد وکیل کی سند بھی رائچور میں مکمل کر لی۔ یہ ڈگری برائے نام ہی تھی۔ آپ نے وکالت کبھی نہ کی۔ جاگیردار گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے اسی لیے اپنی ساری زندگی ادب کی خدمت میں گذاری۔ بہت جلد آپ نے رائچور کو خیر آباد کہا اور حیدر آباد کو اپنا وطن ثانی بنا لیا۔ آپ کی اولاد میں تین صاحبزادیاں اور ایک صاحبزادہ ہے۔ بیٹا پرہلاد راؤ حیدر آباد میونسپل کونسل سے وظیفہ یاب ہیں۔ جذب عالپوری 1973 میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے مگر آج بھی دنیائے ادب میں زندہ ہیں۔

جذب عالپوری اردو کے کہنہ مشق شاعر تھے۔ آپ نے شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ لیکن آپ کو رباعی گوئی میں مہارت حاصل تھی۔ اسی سلسلے میں آپ کو حیدر آباد سے ''خیام آندھرا'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ آپ کو اردو سے بے پناہ رغبت تھی۔ اس بات کا ثبوت آپ کا یہ شعر ہے:

مسلم خادم اردو ہوں اے جذب
فداکارانِ اردو کی دعا سے

(سازِ غزل، ص 179)

آپ کی شاعری کے تعلق سے مختلف شعراء و ادبا کا کہنا ہے کہ:
علامہ کیفی دہلوی لکھتے ہیں:

''جذب کا ہر شعر غزل کی جان ہے۔''

(سازِ غزل، کتاب کی پشت پر)

علامہ سیماب اکبر آبادی

''دکن اور مدراس کے بین بین بیٹھ کر جذب صاحب جس قسم کی شاعری کر رہے ہیں وہ دوسرے صوبوں کے اہل فکر شعرا کے لیے سرمایہ بصیرت ہے۔''

(سازِ غزل، کتاب کی پشت پر)

جذب عالپوری کی شاعری ہر موضوع پر مبنی ہے۔ عام فہم اور نفیس زبان کے استعمال نے شاعری کا اعلیٰ معیار قائم کر لیا ہے۔ آپ کی شاعری میں حسن و عشق کی باتیں بھی ہیں تو زمانے میں انقلاب لانے کا جذبہ بھی ہے۔ آپ کی شاعری میں لکھنؤ کا رنگ بھی ملتا ہے۔ ترقی پسندیت بھی ہے اور تصوف کا فلسفہ بھی ہے۔ جہاں آپ کی شاعری میں زبان کی شیرینی ہے وہیں معنویت بھی ہے۔ آپ ایک منجھے ہوئے شاعر ہیں۔ آپ نے حمدیہ نعتیہ کلام بھی پیش کیا ہے اور عشق و عاشقی کی باتیں بھی کی ہیں۔ چند اشعار آپ کے پیش خدمت ہیں:

عجب نہیں کہ نئی زندگی میسر ہو
مری زبان پہ دم نزع نام ہے تیرا

(سازِ غزل، ص 2)

وطن پر رنگ یہ کیا چھا رہا ہے
زمانہ انقلابی آ رہا ہے

(سازِ غزل،ص195)

ہے خوب وہی واقف اسرار محبت
جو بادۂ الفت سے ہے سرشار محبت

(باغ رعنائی،ص24)

جذب عالپوری کو اردو سے بے حد محبت تھی۔آپ اردو کے خاموش خدمت گار تھے۔اس بات کا اظہار آپ نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

''بہر حال اردو سے انسیت ہونے کے سبب ہندی، سنسکرت، تلگو وغیرہ میں جو نادر چیز دیکھنے میں آتی ہے۔تو ترجے کی دقت کو محسوس کر کے اس کو اردو کا جامہ پہنا کر اہل اردو کے روبرو پیش کرتے ہیں۔اب ترجمہ میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی ہے یا نہیں اور یہ کام مفید ہے یا غیر مفید،اس کا تصفیہ ناظرین کے نظر انصاف پر چھوڑا جاتا ہے۔ہم بہر صورت اردو کی خدمت انجام دینے میں مصروف رہتے ہیں اور ہیں۔''

(جوہر تمثیلات،ص06)

آپ کثیر اللسان مترجم تھے۔آپ نے عربی،فارسی،سنسکرت، ہندی،تلگو،کنڑا جیسی زبانوں سے اردو میں منظوم ترجمے کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔جہاں آپ نے دیگر ادب سے اردو ادب میں اضافہ کیا وہیں آپ نے اردو ادب کی تاریخ کو کنڑا میں لکھ کر کنڑا ادب کے سرمائے کو وسیع کر دیا۔آپ وہ اولین شخص تھے جس نے کنڑا میں اردو ادب کی تاریخ قلمبند کی۔

آپ متعدد تصانیف کے مالک ہیں۔آپ کی تصانیف کی فہرست ذیل کی طرح ہے۔

1۔جوہر تمثیلات: یہ کتاب سنسکرت سے اردو کا منظوم ترجمہ ہے۔
2۔سازِ غزل: یہ غزلوں کا مجموعہ ہے جس میں شاعر نے حرف تہجی میں غزلیں پیش کیں ہیں۔
3۔باغ رعنائی: یہ کتاب مجموعی کلام مشاعرہ شمسیہ ہے۔
4۔رباعیات جذب: اس کتاب میں موصوف کی سو رباعیات شامل ہیں۔
5۔مکتوبات جذب: حصہ اول
6۔مکتوبات جذب: حصہ دوم
7۔مہاتما بسویشور وچن امرت: کنڑا سے اردو منظوم ترجمہ
8۔مرگِ زار: سنسکرت سے اردو ترجمہ
9۔آہنگِ جذب: رباعیات وقطعات
10۔اردو ساہتیہ چرتر: کنڑا میں اردو ادب کی تاریخ

جذب عالپوری نے تلگو،سنسکرت،ہندی سے بے شمار ترجمے اردو میں کیے ہیں۔لیکن کنڑا سے اردو میں آپ نے وچنوں کا منظوم ترجمہ پابند نظم میں پیش کر کے اردو داں طبقہ کی دلچسپی کو بڑھانے کی کامیاب سعی کی ہے۔آپ کی یہ کوشش قابل تحسین ہے۔کنڑا سے اردو میں آپ کی یہ پہلی کوشش ہے اور کنڑا اردو ترجمہ کی روایت کی پہلی سیڑھی مانی جاسکتی ہے۔

کنڑا سے اردو زبان کا ترجمہ بہت مشکل ہے۔دونوں زبانوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔لسانی مزاج الگ،تہذیب وثقافت،لفظیات و محاورات بھی متضاد،زبان کی اصطلاحات بھی جدا۔اس زبان کا ترجمہ نہایت مشکل ہے۔مگر عالپوری نے یہ کام خوبصورتی سے کر دکھایا۔آپ کے اس ترجمہ سے اردو لغت میں نئے نئے الفاظ کا اضافہ ہوا ہے۔

گیارھویں صدی کے صوفی سنت شری بسویشور نے اپنے وچنوں

میں خدا کی وحدانیت اور اس کی تعریف کی ہے تو کہیں خندہ پیشانی سے دعا کرتے نظر آتے ہیں۔ بسویشور کے اس وچن کا جذب عالپوری نے بڑی ہی باریک بینی سے ترجمہ کیا ہے۔ وچن کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

بھٹکوں نہ کہیں، کردے اپاہج بابا!
دیکھوں نہ کہیں، کردے مجھے اندھا بابا!
کچھ سن نہ سکوں، کر مجھے بہرا بابا!
چرنوں میں رہے نفس، نہ بھٹکے وہ کہیں
اتنا کرائے کوڈلا سنگم دیو!

(مہاتما بسویشور وچن امرت، ص14)

جذب عالپوری نے ترجمے میں بالکل سادہ و نفیس الفاظ کا استعمال کیا ہے جو قاری کے فہم و ادراک پر آسانی سے کھلتا ہے۔ وچن کار کے مرکزی خیال کو مترجم نے ترجمے میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مہاتما گاندھی بھی بسویشور کے شیدائی تھے۔ گاندھی جی کا یہ قول اس وچن کی ترجمانی کرتا ہے۔ ''بُرا کہنا نہیں، بُرا سننا نہیں، بُرا دیکھنا نہیں''۔

شری بسویشور نے اپنے وچن میں انسانوں کو انسانیت کا درس دیتے ہوئے جانوروں کے اوصاف کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کس طرح جانور، پرندے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ ان کے وچن میں پوشیدہ جذبہ کو عالپوری نے اردو میں بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ کریں:

ایک دانہ کہیں بھی دیکھ پائے کوا
وہ اپنی جماعت کو نہ دیں کیوں آواز
کھانے کی کوئی چیز اگر دیکھے مرغ
اپنے طبقے کو پھر بلائے وہ نہ کیوں
بھکتی نہ ہو جس میں شیو کا بندہ ہو کر
اس مرغ سے کوے سے بھی وہ ہے بدتر
اے کوڈلا سنگم دیو

(مہاتما بسویشور وچن امرت، ص23)

یہ بات حقیقت ہے کہ پرندے کو جو کچھ بھی ملتا ہے ایک دوسرے سے بانٹ کر کھاتے ہیں اور ایک مثال جانوروں کی ہے جیسے کتا۔ اگر کتے کو کھانے میں ایک سے زائد ہڈی مل جاتی ہے تو وہ اپنے قریب کسی دوسرے جانور کو بھی پھٹکنے نہیں دیتا اور جو بچ جاتا ہے وہ اگلے وقت کے لیے زمین میں دفن کر دیتا ہے تاکہ وہ اسے دوبارہ کھا سکے۔ بسویشور کا یہ وچن اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کی نظر میں وہی سچا عقیدت مند ہے جو بانٹ کر کھاتا ہے۔ اگر انسان ایسا نہیں کرے گا تو وہ کوے اور مرغ سے بھی حقیر ہے۔

جہاں تک عبادت و ریاضت کا معاملہ ہے۔ اللہ رب العزت نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی اہمیت اور بندے کے فرائض کو سمجھایا ہے۔ بسویشور بھی اسی کی وضاحت اپنے وچنوں میں کرتے نظر آتے ہیں۔ جس کا جاندار ترجمہ جذب عالپوری نے کیا ہے:

وچن کا ترجمہ

اوروں کے دل و جان کو ایذا دے کر
پائیں بھی تو کیسے تیرے چرنوں کو
یہ بات انہیں کیوں نہ جلائے
سنگم دیو
''اوروں کی جو ایذا ہے وہ رب کی ایذا''

(مہاتما بسویشور وچن امرت، ص24)

وچن کا ترجمہ

چڑھاتے دودھ ہیں پتھر کے ناگ کو اکثر
حقیقی سانپ کو دیکھیں تو کہتے ہیں مارو
فقیر آئے جو بھوکا تو کرتے ہیں پیش نذر و نیاز
خدا کے بندوں کی تحقیر گر کرے کوئی
حقیر بن کے ہر ایک کی نظر سے گرتا ہے

(مہاتما بسویشور وچن امرت، ص30)

اے بندے اگر تو اللہ رب العزت کی خوشنودی چاہتا ہے تو یہ ضروری ہے کہ تو خدا کے بندوں کی خدمت کرے، ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرے، بھوکوں کی شکم سیری کرے، پیاسوں کی پیاس بجھائے، ان سے محبت کرے، یہی خدا کی عبادت ہے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

(بانگِ درا، ص151)

□□□

Zulekha Begum Chaand
H .No. 44/37
Near Zaina Masjid
Adilpur Shahapur
Distt. Yadgir-585223 (Karnataka)

امینہ فاروقی محمد امام الدین

اکیسویں صدی میں اردو ناول میں عصری مسائل

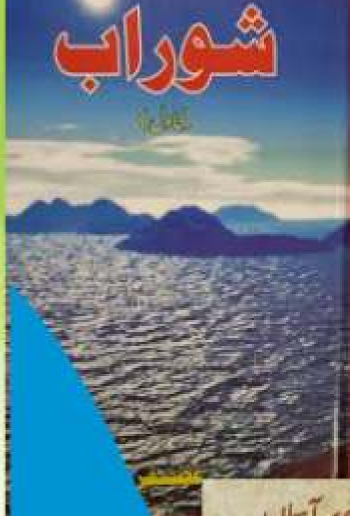

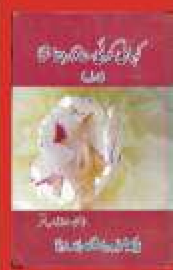

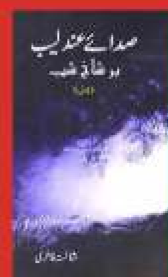

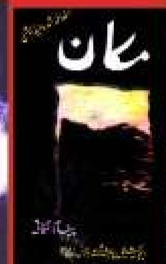

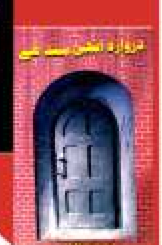

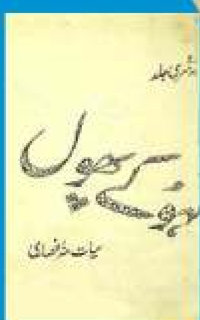

اُردو میں اب ناول نے اپنے حقیقی امتیازات کے گونا گوں مراحل طے کر لیے ہیں۔ابتداء میں داستانیں لکھی گئیں، جو ہمارے فکشن کا قیمتی سرمایہ ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ناول کی بنیاد ڈالی نذیر احمد سے لے کر مرزا ہادی رسوا اور پھر قرۃ العین حیدر، کرشن چندر، پریم چند، عصمت چغتائی سے ہوتا ہوا ناول موجودہ زمانے میں غضنفر، پیغام آفاقی، مشرف عالم ذوقی، سلام بن رزاق، عبد الصمد، نورالحسنین تک بیانیاتی ماڈل کے کئی مرحلے طے کیے ہیں۔سبب اور مسبب کے بیانیے سے آگے بڑھ کر ناول نے اب ضربی بیانیہ کے اسلوب کو اختیار کرتے ہوئے حقیقت کو کئی زاویوں سے دیکھنے کی روایت خلق کر دی ہے۔ اُردو میں نثر کے اصناف میں ناول نگاری کی عمر زیادہ نہیں ہے، لیکن اُردو ناول کی یہ خوش قسمتی رہی کہ اسے ہر عہد میں عہد ساز ادیبوں کی سرپرستی حاصل رہی جنھوں نے اس کے ارتقائی سفر میں نمایاں کردار ادا کیا۔

اُردو ناول میں رومانیت، حقیقت نگاری، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے رجحانات اپنے اپنے عہد میں غالب رہے ہیں۔جن کے تحت زندگی سے فرار، موت سے پیار، حقیقت کا اکھرا بیان، سامراج دشمنی، وطن دوستی، وجودیت لایعنیت، قدروں کا زوال، احساس شکست اور بیگانگی جیسے موضوعات اُبھر کر سامنے آئے۔ اکیسویں صدی کا اُردو ناول اس لحاظ سے بالکل مختلف ہے کہ آج کے ناول سماجی ڈسکورس اور زندگی سے جڑے ہوئے مسائل کو بیان کرنے میں کسی نظریاتی پابندی کا شکار نہیں ہے۔آزاد اس طرح کہ یہ ناقدوں کے بنائے ہوئے فارمولوں، قاری کے مطالبوں، مذہبی ٹھیکے داروں کے خوف اور کسی بھی آئیڈیالوجی کی پابندی کیے بغیر فطری پن کے ساتھ اپنا اظہار کر رہا ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ مابعد جدیدیت، نسائی حسیت، حقیقت کا ہمہ جہت بیان، دلت مسائل، قومی اور عالمی مسائل کی عکاسی، تعلیمی مافیا اور رشتوں کی حرمت کا بدلتا تصور اس صدی کے ناول کے اہم موضوعات رہے ہیں۔ کسی بھی زبان کا معیاری ناول اپنے سماجی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کی تاریخ بھی ہوتا ہے اور اپنے عہد کا ترجمان بھی۔

ہر دور اپنے کچھ موضوعات اور مسائل لاتا ہے۔آج ہم اکیسویں صدی کی دوسری دہائی گذار چکے ہیں۔رواں صدی سائنس اور ٹیکنالوجی تیز رفتار ترقی کی صدی ہے جس میں انٹرنیٹ، موبائل فون، لیپ ٹاپ، واٹس اپ، کمپیوٹر اور ترسیلی ذرائع سوشل میڈیا کے وہ تمام اسباب مہیا ہیں کہ جنھوں نے اپنی بہترین کارکردگی سے پوری دنیا کو ایک عالمی گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔پورا تہذیبی و ثقافتی منظر نامہ ایک نئی صورت اختیار کر چکا

ہے جس کا اثر ادب پر بھی ہوا ہے۔نئی تہذیب کے آجانے سے اُردو ناول بھی متاثر ہوا ہے۔

نئی صدی میں رونما ہونے والے متحیر کن سائنسی و تکنیکی حالات، واقعات میں جہاں انسان کی زندگی ایک نئی ڈگر پر آگئی ہے وہیں اخلاقی و روحانی قدریں بھی شکست وریخت کے عمل سے گزر رہی ہیں۔رشتوں میں خلوص کے بجائے ظاہر داری اور مصلحت پسندی آگئی ہے۔وحشت و بربریت عام ہوگئی جنسیات وخمریات میں لوگ زیادہ دلچسپی لینے لگے۔

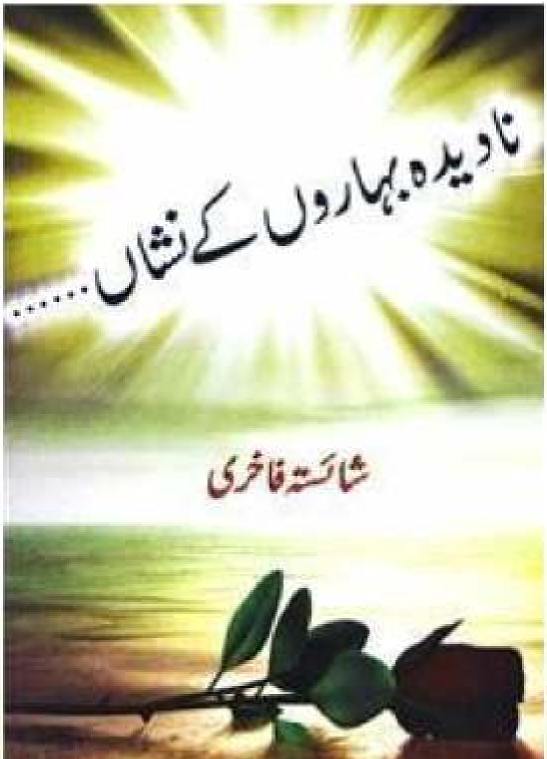

موبائل فون نے اجتماعی زندگی کے سارے مواقع چھین لیے ہیں جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباو طالبات نے موبائل اور انٹرنیٹ کا غلط استعمال کرنا شروع کردیا جس کے نتیجے میں جہاں معلومات کا خزانہ انگلیوں پر آگیا وہیں جنسی جرائم کا گراف بڑھتا چلا گیا۔

اس کے ساتھ ساتھ دیگر جرائم میں اضافہ ہوا۔علاقائیت ،فرقہ پرستی،سیاسی داؤپیچ کے لیے مذہب کا سہارا لیا جانے لگا۔غرض کہ اکیسویں صدی کی ڈیڑھ دہائی کے دوران لکھے جانے والے اُردو ناولوں میں ان تمام بحرانی اور تشویشناک صورتحال کو موضوع بنایا گیا۔

اگرچہ گفتگو کا حوالہ اکیسویں صدی میں اُردو ناول میں عصری مسائل ہے،لیکن ان سولہ برسوں میں لکھے گئے ناول دراصل پچھلے بیس برسوں میں تیزی سے بدلتے ہوئے عالمی منظرنامے کا نتیجہ ہیں۔جن میں ترقی یافتہ ملکوں کا ترقی پذیر ملکوں پر اجارہ داری کے رجحان پر اکثر وبیشتر تنقید نظر آتی ہے۔عالمی دہشت گردی کے نام پر کئی ملکوں کو غیرضروری جنگوں کا حصہ بنایا گیا،معاشی فائدے کے لیے لاکھوں بے گناہ کا خون بہایا گیا اور دنیا کو دو بلاکوں میں جاری رہنے والی جنگ کو ایک بلاک کے خاتمے کے بعد اسے دو تہذیبوں کی جنگ میں تبدیل کردیا گیا جس کے عمل اور ردعمل کے نتیجے میں تہذیبی تشخص کے نام پر اصرار بڑھا اور عوامی اور حکومتی سطح پر ایک نئی طرح کی انتہا پسندی کا آغاز ہوا۔سماجی اور معاشی مسائل کی بہترین فنی اور فکری عکاسی ہمارے ناولوں میں نظر آتی ہے۔اس کے علاوہ افراد کی رشوت خوری،دلت مسائل،عورت کے تشخص کا مسئلہ،روزگار کی تلاش میں دوسرے ملکوں کی طرف ہجرت،تعلیمی اداروں میں ایجوکیشن مافیاؤں کا تسلط اور انٹرنیٹ اکسس کرنے والی نئی نسل کا جنسی جرائم کی طرف رغبت جیسے موضوعات کو اُردو ناول میں تہہ دار اور تکثیری بیانیوں اور جدید ترین تکنیک کے ذریعے ان مسائل کی جڑوں تک رسائی حاصل کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

"فیمنزم" یا نسائی حسیت اکیسویں صدی کے ناولوں میں اہم موضوع رہا ہے اور عورت مرکزی پیراڈائم کا بیانیہ ناولوں کا اہم مزاج قرار پایا ہے۔آج کی ہندوستانی عورت شعوری طور پر کافی حد تک بیدار ہوچکی ہے،وہ مردمانحت نظام سے باہر آچکی ہے۔جبر واستحصال کے خلاف پوری قوت سے لڑرہی ہے،سماجی اور قومی سطح پر اپنا قائدانہ کردار نبھارہی ہے اور اپنے وجود کو منوانے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف ہے۔آج کے اُردو ناول میں جو عورت نظر آتی ہے وہ مردوں کے اشاروں پر چلنے والی ،معشوقہ کا کردار نبھانے والی یا بہت بولڈ ہوئی تو محض سوال قائم کرنے والی نہیں بلکہ اس سے بہت آگے کی صاحب اختیار اور خود فیصلہ لینے والی عورت ہے جو اپنی اہمیت اور حقوق سے پوری طرح باخبر ہے۔اس کا خوبصورت اظہار صادقہ نواب سحر کے ناول "کہانی کوئی سناؤ متاشا" ثروت خان کے ناول "اندھیرا پگ" اور شائستہ فاخری کے ناول "نادیدہ بہاروں کے نشاں" میں ہوتا ہے۔شائستہ فاخری کا ناول "نادیدہ بہاروں کے نشاں" شائع ہونے سے پہلے ہی مقبول ہوچکا تھا۔اس میں بھی عورت کی مظلومیت اور بے بسی کو ہی موضوع بنایا گیا ہے جو مرد کی خودغرضی،انانیت اور اس کی ذہنیت کا نتیجہ ہے۔

مصنفہ نے ایک نازک مسئلے ''حلالہ'' کو بڑی بے باکی اور سچائی کے ساتھ اس ناول میں اٹھایا ہے۔ یہ ناول نہ صرف عورتوں کی ناقدری، مظلومی اور اس کے جذبہ ایثار کو پیش کرتا ہے بلکہ مردوں کو ان کے جابرانہ رویے کے تعلق سے دعوت احتساب بھی دیتا ہے ساتھ ہی یہ ناول قاری کو بار بار اس امر پر سوچنے کی دعوت دیتا ہے کہ کیا ایک عورت مرد کے بغیر اس دنیا میں اپنی زندگی بسر کر سکتی ہے؟ راجستھان کے مرد اساس معاشرے کے پس منظر میں عورتوں کی زبوں حالی پر لکھا گیا ثروت خان کا ناول دراصل صدیوں سے عورتوں کی جنسی اور ذہنی محکومی سے تانیثی بغاوت کا اعلان نامہ ہے، تو شائستہ فاخری کے ناول کی مرکزی کردار 'حلیزہ'، تعلیم یافتہ متمول اور مہذب سماج میں چلے آرہے عورت کے ہمدردانہ استحصال کو ختم کر کے اس کے صاحب فیصلہ اور خود مختار ہونے کا اعلان کرتی ہے۔

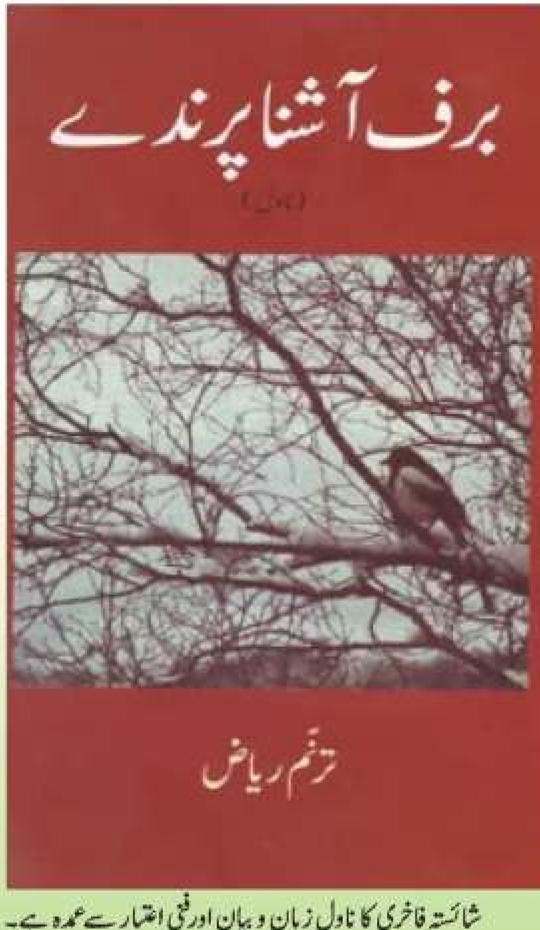

شائستہ فاخری کا ناول زبان و بیان اور فنی اعتبار سے عمدہ ہے۔

اکیسویں صدی میں خواتین کے تین ناول ''برف آشنا پرندے''، ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' اور ''صدائے عندلیب برشاخ شب'' قارئین کی سنجیدہ توجہ کا مرکز بنے۔ ترنم ریاض کا ناول ''مورتی'' 2004 کے عنوان سے شائع ہو چکا تھا۔ جس میں انھوں نے ازدواجی زندگی کے مسائل اور ناکام ازدواجی زندگی کے اسباب کو موضوع بنایا۔ یہ ناول پیش کش کے سپاٹ پن کی وجہ سے بہت زیادہ مقبول نہیں ہو سکا۔ لیکن 2009 میں شائع ہونے والا ان کا ضخیم ناول ''برف آشنا پرندے'' نسبتاً زیادہ پسند کیا گیا۔ اس ناول کی سب سے بڑی خوبی کشمیر کی معاشرتی، سماجی اور تہذیبی پیشکش ہے جس کی تفصیل اور باریک جزئیات کشمیر سے ناواقف قاری کو نہ صرف متحیر کرتی ہے بلکہ نئی دنیا اور نئی ثقافت سے متعارف کراتی ہے۔ طرز رہائش سے دسترخوان کی تفصیلات تک ہر گوشے کو بڑی وضاحت اور سچائی سے پیش کیا گیا ہے وہاں کی سیاست اور مسائل پر گفتگو کم کی گئی ہے تہذیبی تاریخ کی پیشکش پر زیادہ زور ہے۔

صادقہ نواب سحر کے ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' نے مقبولیت کی سرخیاں خوب بٹوریں۔ اس ناول کا موضوع عورت کا استحصال (ہمارے سماج میں کن کن حوالوں سے کیا جاتا ہے) اُس پر نئے سیاق و سباق میں غور و فکر ہے۔ واحد متکلم زاویہ میں لکھا گیا اس ناول کا موضوع کوئی نیا نہیں مگر خود عورت کی زبانی عورت کے استحصال کی طویل داستان جس باریک بینی، تفصیل اور دردمندی سے بیان کی گئی ہے وہ اسے توجہ طلب بنا دیتی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار متاشا ہے کہانی اسی کے اردگرد گھومتی رہتی ہے۔ اس لیے وہ قاری کے دل و دماغ میں بھی گردش کرتی رہتی ہے۔ مصنفہ نے ایک عورت کے کرب والم کو، اس کی بے بسی کو، ایسی پُر اثر زبان میں پیش کیا ہے کہ اس کی مظلومیت کی داستان قاری میں حد درجہ تجسس پیدا کرتی ہے اور قاری ناول ختم کرنے کے بعد بھی اس کے درد کو بہت دیر تک محسوس کرتا رہتا ہے۔ یہی مصنفہ کی کامیابی ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج کی اس نئی عورت کو ہمت اور حوصلہ خواتین ناول نگار دے رہی ہیں اور کافی حد تک ان کے حقوق کی لڑائیاں بھی لڑ رہی ہیں۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اپنے حقوق سے واقف یہ عورت خواتین ناول نگاروں کے مقابلے میں مرد ناول نگاروں کے یہاں کہیں زیادہ ہمت، حوصلے اور قوت کے ساتھ سامنے آئی ہیں، اس کی مثالیں پیغام آفاقی کے ناول ''مکان'' کی 'نیرا' اور شمس الرحمن فاروقی کے ناول ''کئی چاند تھے سرآسماں'' کی 'وزیر بیگم' ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ 'اکیسویں صدی اُردو ناول کی صدی ہوگی' اس لیے کہ پچھلے چند سالوں میں اتنے خوبصورت معیاری ناول لکھے گئے ہیں کہ اُردو ادب میں ایک اضافے کی حیثیت

حاصل ہوئی ہے ان میں چند ناول نگاروں پر ہم پہلے گفتگو کر چکے ہیں۔غضنفر کا ''مانجھی''، نورالحسنین کا ''آہنکار''، رحمٰن عباس کا ''خدا کے سائے میں آنکھ مچولی'' وغیرہ ان تمام ناولوں میں ہم دیکھیں تو یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ ہمارے آج کے ناول نگاروں نے زندگی سے جڑا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جسے پیش نہ کیا ہو، چاہے وہ پیغام آفاقی ہوں، غضنفر ہوں، ، عبدالصمد ہوں یا مشرف عالم ذوقی ہوں، نورالحسنین ہوں ان کے ناولوں میں تمام انسانی زندگی اور ان کے مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے۔

غضنفر نے دلت سماج پر اُردو کا پہلا باضابطہ دلت ناول ''دوّیہ بانی'' لکھا جس میں دلت سماج کے کرب والم کو ظاہر کیا گیا ہے۔جدید اُردو ناول میں ایک رجحان تعلیمی اداروں میں کرپشن سے متعلق فکر مندی کا بھی ہے۔جس پر غضنفر نے ''شوراب'' جیسا شاہکار ناول تحریر کیا۔اس سلسلے کا ایک اور ناول 2013 میں غیاث الدین کا ''زوال آدم خاکی'' شائع ہوا۔

''نائن الیون'' کے واقعے نے دنیا کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔وہ ملک جو دنیا کی تقدیر لکھ رہا تھا اس کی اجارہ داریوں پر سوال اٹھ کھڑے ہوئے۔اس واقعے نے دنیائے ادب کو بدل دیا اس پر فکشن کو ایک نیا موضوع بھی دیا۔نائن الیون نے صرف تاریخ کا ایک نیا باب ہی نہیں لکھا بلکہ دونوں طرف کے لوگوں کی نفسیات بھی بدلی اور بہت سے ملکوں کے سیاسی اور معاشی حالات بھی بدلے اور وہاں رہنے والوں کے نظریات وتصورات بھی، اُردو فکشن میں اس کا کئی طرح سے جائزہ لیا جارہا ہے۔اس موضوع پر 2002 میں چھپنے والا اشفق کا ایک خوبصورت ناول ''بادل'' ہے۔ناول 11 ستمبر 2001 کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر ہونے والے حملے کے ذکر سے شروع ہوتا ہے۔فرد واحد پر غیر ثابت شدہ الزام کی بنیاد پر کس طرح مسلمانوں کو نفسیاتی دباؤ اور مجرم ضمیری کے احساس میں مبتلا کرنے کی کوششیں کی گئیں، ہندوستان میں اس کا کیا اثر ہوا، اور ہندوستانی مسلمانوں کو اس حوالے سے کن کن سوالوں سے دوچار ہونا پڑا، ان کی زندگی اور روّیوں میں کیا تبدیلی آئی اور وہ کس طرح کے خوف اور اندیشوں میں مبتلا ہوئے، ان تمام باتوں کا بڑا ہی سلیقے مند، سچا بیان اس میں موجود ہے۔اسی موضوع پر تقریباً ان ہی واقعات کے حوالے سے 2003 میں صلاح الدین پرویز نے اپنا ناول ''وارڈی جرنلس'' تحریر کیا تھا۔اس میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے دونوں ٹاوروں کو تباہی کی بنیاد بنا کر افغانستان اور عراق میں پیدا کی جانے والی بھیانک صورت حال بالخصوص بچوں کی لاچاری اور مجبوری کو بیان کیا گیا ہے۔

2002 میں احمد صغیر کا ''دروازہ ابھی بند ہے'' کے نام سے ایک ناول شائع ہوا۔یہ ناول ملک کی عوام کے ساتھ ظلم وزیادتی، ان کی عورتوں کی بے حرمتی، اپنے ہی ملک کی پولیس کی جانبداری، ایک خاص نظریہ رکھنے والے لوگوں کی ذہنیت اور سیاستدانوں کے روّیوں کو بیان کرتا ہے۔لیکن ساتھ ہی ظلم وبربریت کے اندھیرے میں سوہن داس جیسے انسان کو بھی دکھایا گیا ہے جو اپنے خاندان کے ساتھ ایک مسلم لڑکی کی حفاظت کرتا ہے اپنے گھر میں اسے پناہ دیتا ہے اور آخر کار اسے اس کے لٹے ہوئے خاندان سے ملواتا ہے۔ظلم وزیادتی سہنے کی کہانی لکھتے ہوئے ایسا متوازن رویہ اپنانا ناول نگار کی انسانی دوستی پر یقین کو عیاں کرتا ہے۔

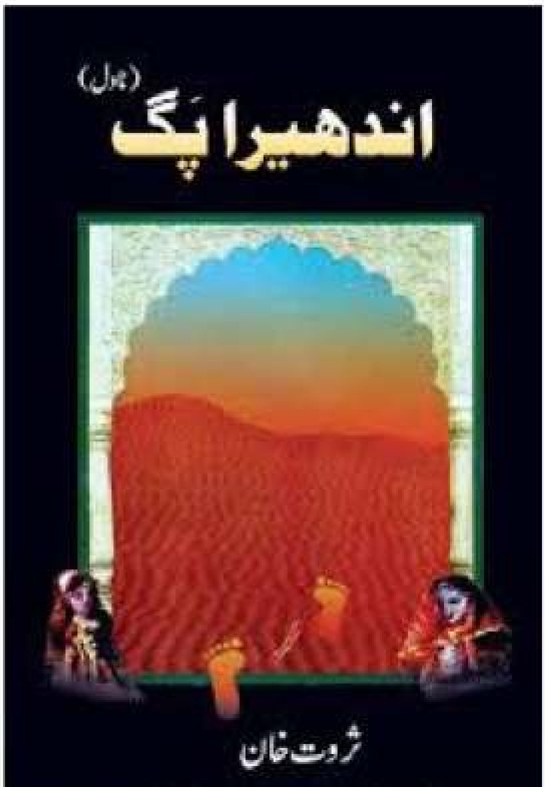

اُردو فکشن میں سیاست کا بیان پہلے بھی ہوتا تھا آج بھی ہو رہا ہے۔پریم چند کے ناول میدان عمل، گئودان، گوشہ عافیت، میں اپنے عہد کا تہہ دار سیاسی بیانیہ خلق کیا گیا ہے۔حیات اللہ انصاری کا ناول ''لہو کے پھول'' سیاسی تاریخ سے بھرا ہوا ہے۔اُردو فکشن منفی سیاست کے اس زہر اور اس سے پیدا ہونے والے مہلک اثرات کو تمام حقیقتوں کے ساتھ پیش کر رہا ہے۔2003 میں چھپنے والا شوکل احمد کا ناول ''مہاماری'' اور 2004 میں عبدالصمد کا ''دھمک'' اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

''دھمک'' میں سیاست کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ناول کا آغاز گاؤں کی دلت لڑکیوں کے اجتماعی زنا بالجبر کا بدلہ لینے کے واقعے سے

شروع ہوتا ہے۔ شموئل احمد کے ناول ''مہاماری'' میں ذات پات کے کھیل، رشوت کے لین دین، جنسی استحصال، عہدوں کے لالچ اور چھوٹے بڑے اختیارات کی بربریت 2002 میں شائع ہونے والا محمد علیم کا ناول ''میرے نالوں کی گمشدہ آواز'' تاریخ کے جبر اور مسلسل استحصال کی داستان ہے۔ 2011 میں آنے والا پیغام آفاقی کا ''پلیتہ'' بھی سیاسی موضوع پر ہے۔ جس میں فلسفہ، سیاست اور سازش بھی کچھ موجود ہے۔ علی امام نقوی کا ''بساط'' عمدہ ناول ہے جو کشمیر کے مسائل کو پیش کرتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی نئی سوچ، نئی نسل، انوکھی نفسیات اور نئی تکنیک کے فکشن نگار ہیں۔ ان کے تین ناول منظر عام پر آئے۔ ''آتش رفتہ کا سراغ''، ''لے سانس بھی آہستہ'' اور ''پوکے مان کی دنیا''۔

''پوکے مان کی دنیا'' یہ ناول پرانی سنسکرتی پر ناز کرنے والے ہندوستان میں ایک بالکل نئی تہذیب کے جنم لینے کی کہانی ہے۔ ناول کا پس منظر نئی ٹکنالوجی کے استعمال اور کنزیومر ورلڈ کی عطا کردہ تنہائی ہے۔ مرکزی حوالہ بلوغیت کی جانب ان بڑھتی عمر کے بچوں کو بنایا گیا ہے جن کے ماں باپ کو اپنے دفتروں میں کاروبار اور دوسری پیشہ ورانہ مصروفیتوں کی وجہ سے ان کے دیکھ بھال کے لیے وقت یا تو بالکل نہیں ملتا یا بہت کم مل پاتا ہے اور بچوں کو زیادہ سے زیادہ اکیلے رہنے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ نتیجہ تنہائی دور کرنے کے لیے وہ کمپیوٹر اور ویب سائٹ پر توجہ دینے لگتے ہیں۔ اس ناول میں جنسی جرائم کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ بچوں کے موضوع پر پہلا ناول نہیں ہے۔ اس سے پہلے کرشن چندر ''دادر پل کے بچے'' اور علی امام نقوی ''تین بتی کے راما'' لکھ چکے ہیں۔ لیکن ''پوکے مان کی دنیا'' ان سے بالکل الگ اور نئی طرز کا ناول یوں ہے کہ ناول نگار نے سماج میں طویل عرصے سے موجود برائی یا قدیم استحصال کی نقاب کشائی نہیں کی، بلکہ ابھرنے والے ایک بالکل نئے خطرے کی آہٹ کو موضوع بنایا ہے۔ یہ ناول غریب بچوں کی داستان نہیں بلکہ کھاتے پیتے امیر گھرانوں کے بچوں کی کہانی ہے۔ دلچسپ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ 16 دسمبر 2012 کے بعد جو سروے آئے ہیں وہ یہ کہ پچھلے دس پندرہ سال میں ملک کے بڑے شہروں میں جنسی جرائم کا ارتکاب کرنے والوں میں سب سے بڑی تعداد ''جوینائل'' کی ہے۔ اور مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ ان جرائم کی طرف کم عمر لڑکوں کی رغبت کے بیشتر اسباب وہ ہیں جو ''پوکے مان کی دنیا'' میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ ناول تب لکھا گیا تھا، جب دوسرے سماجی اداروں نے کم از کم اس خطرے کی طرف سنجیدگی سے سوچنا شروع نہیں کیا تھا۔ اس لیے اس بات پر ایقان مزید مستحکم ہوتا ہے کہ فنکار مستقبل کی آہٹ کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شدت سے محسوس کرتا ہے۔

2013 تک رحمٰن عباس کے تین ناول ''خدا کے سائے میں آنکھ مچولی''، ''ایک ممنوعہ محبت کی کہانی'' اور ''نخلستان کی تلاش'' منظر عام پر آئے۔ ''خدا کے سائے میں آنکھ مچولی'' ایک ایسے معاشرے کا بیان ہے جو دراصل ویسا نہیں جیسا وہ دکھائی دیتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ ناول میں ایک مخصوص معاشرے کے اہم اوصاف ایسے لوگوں کے ہیں جو ان کے اہل یا حقدار ہیں ہی نہیں۔ ''ایک ممنوعہ محبت کی کہانی'' کے روپ میں عشق کے بیانیے کو ناول کے حرم میں داخل کیا گیا۔

رحمٰن عباس کا تیسرا ناول ''نخلستان کی تلاش'' ہندوستان کی موجودہ صورت حال کا بیانیہ ہے۔

نورالحسنین کا پہلا ناول ''آہنکار'' ہے۔ جس کو مصنف نے اپنے ہی گاؤں کے پس منظر میں تحریر کیا ہے۔ دوسرا ناول ''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' جو 1857 کی جنگ آزادی کے ان مجاہدوں کی حالت زندگی پر ہے جو تاریخی شخصیتوں کے ساتھ شانہ بہ شانہ جنگ آزادی میں شریک رہے اور شہید بھی ہوئے لیکن مورخ کا قلم صرف شاہانِ وقت کی افتاد کا ہی نوحہ گر رہا، عام افراد کی زندگیوں سے وہ ایک طرح سے لاتعلق ہی رہا، اس ناول کے فرضی کردار اُس زمانے کے عام افراد کی نمائندگی کرتے ہیں جو تاریخی شخصیات کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلے۔ تیسرا ناول ''چاند ہم سے باتیں کرتا ہے'' یہ ناول 500 قبل مسیح سے شروع ہو کر زمانہ حال پر ختم ہوتا ہے۔

اس مختصر سے مطالعے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ اکیسویں صدی میں اُردو ناول کا مستقبل تابناک ہے۔

حواشی:

اکیسویں صدی میں اُردو ناول۔۔ ڈاکٹر سیفی سرونجی

دربھنگہ ٹائمز۔ ناول نمبر۔ اپریل۔ جون 2016

فکر و تحقیق۔ ناول نمبر۔ اپریل۔ جون 2016

سہ ماہی ادب سلسلہ علیگڑھ جولائی تا دسمبر 2016 vol.1 issue.2

□□□

Amena Farooqi MD. Imamuddin
Asst.Prof.Dept.of Urdu
Pramiladevi Patil Art's &
Sciece College Neknoor
Dist. Beed-431122 (M.S)

استوتی اگروال

اردو غزل کا مستقبل

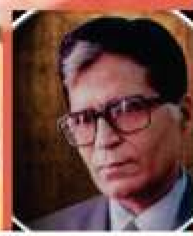

غزل اردو شاعری کی وہ صنف ہے جسے اردو شاعری کی آبرو کہا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ غزل شروع سے لے کر آج تک اردو ادب میں سب سے مقبول صنف رہی ہے۔ غزل کو کئی مخالفتوں سے بھی گزرنا پڑا ہے، ترقی پسندوں میں جن میں کیفی اعظمی، علی سردار جعفری اور ساحر لدھیانوی تھے انھوں نے تو غزل کا بائکاٹ ہی کر دیا تھا، لیکن مجروح سلطانپوری اور خمار بارہ بنکوی نے غزل کی آبرو بچائی اور غزل کو بلندی عطا کی۔ یوں تو غزل پہلے سے ہی ایک اہم صنف رہی ہے، لیکن ان تمام مخالفت کے باوجود غزل اپنا معیار متعین کرنے میں کامیاب رہی غزل کی جتنی مخالفت کی گئی اتنی ہی اس کی شہرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ غزل نے ہر عہد میں زمانے سے آنکھیں ملائی ہیں۔ ولی دکنی سے لے کر شکیب جلالی اور ظفر صہبائی تک غزل نے ہر عہد کی ترجمانی کی ہے۔ اردو غزل سے متعلق سید محمد عقیل لکھتے ہیں...

"نیا غزل گو خود عملیت پسند ہے، اگر چہ اس کے ساتھ غزل گوئی کی تین نسلیں سانسیں لے رہی ہیں۔ اس کے پاس ماضی کی کلاسکیت بھی ہے، ترقی پسندوں کا فکر اندوختہ بھی، جدیدیوں کے الفاظ اور زبان کی معنوی پرتوں کے تجربے بھی، پھر ان کے ساتھ ان کی اپنی زندگی کے نجی اور سماجی تجربے، سب ساتھ ساتھ چل رہے ہیں، جس میں بیانیہ کا غیر جذباتی رویہ حاوی ہے۔ اس مابعد جدید غزل میں نہ تو ڈھول دھڑکا ہے اور نہ دھوم مچانے کا شوق یا جذبہ ہے، کبھی کبھی تو یہ غزلیں اتنی غیر جذباتی ہو جاتی ہیں کہ سادہ بیانی، نظمانے اور شعری بیان کے دائرے بنانا مشکل ہو جاتا ہے، جس پر غیر شعر ہونے کا الزام اور سوالیہ نشان لگایا جاسکتا ہے"۔

غزل میں کوئی موضوع ایسا نہیں جو نہ برتا گیا ہو۔ ہمارے اردگرد سے لے کر، ہماری زندگی کے دکھ درد، کرب، بے چینی، عشق، پیار، محبت، پھول، پتے، خدا، ایسا کوئی موضوع نہیں جو غزل سے اچھوتا رہا ہو۔ غزل نے آج کے انسانی چہروں کو اجاگر کیا، غزل ہی ایک ایسی صنف ہے جو ہماری افسردگی کو ختم کرتی ہے۔ زندگی کے کرب، دکھ، تکلیف سے نجات دلاتی ہے اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ ہر عمر کے لوگوں کے لیے غزل ہی ایک ایسی صنف ہے جو ذہنی سکون مہیا کرتی ہے، کیونکہ غزل میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کا ہر شعر منفرد اور الگ مفہوم

لیے ہوتا ہے اور قاری کے ذہن کو متاثر کرتا ہے۔ شاعر ادیب اپنے تجربے، اپنے جذبات، زندگی کے درد و کرب، مشکلات، پیار، محبت سبھی جذبات احساس میں ڈھل کر ایک شعری پیکر اختیار کر لیتا ہے۔ شاعر چونکہ بہت حساس اور نرم دل ہوتا ہے، وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے جن راستوں سے گزرتا ہے اگر کانٹوں بھرے راستے سے گزرا تو اس کی شاعری میں وہی چبھن دکھائی دے گی۔ کچھ اشعار پیش کرتی ہوں جن میں ہمارے عہد کی بھرپور ترجمانی کی گئی ہے اور مختلف موضوعات پر شاعروں نے اپنے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں سب سے پہلے اردو غزل کے پہلے شاعر ولی دکنی کا شعر:

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

(ولی دکنی)

سب سے پہلے میں نے شعر اس لیے پیش کیا ہے کہ اس شعر میں ولی دکنی نے زندگی کی تلخ سچائیوں کو پیش کیا ہے کہ مفلسی کیا کیا رنگ دکھاتی ہے کہ آدمی کا اعتبار بھی قائم نہیں رہتا، اسی طرح غزل زینہ بزینہ ترقی کی منزلیں طے کرتی ہوئی آج اس مقام پر پہنچ گئی کہ اردو شاعری کی کوئی صنف بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ یہ غزل کا ہی جادو ہے کہ آج دنیا بھر میں غزل کو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ مشاعرے اس کا زندہ ثبوت ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب 'اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب' میں غزل کی اہمیت اور اس کی خصوصیات سے بہت تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ غزل ہی وہ صنف ہے جس میں ہندوستانی ذہن و تہذیب رچی بسی ہوئی ہے۔ چند شعر دیکھئے...

لپٹ جاتا ہوں ماں سے اور موسی مسکراتی ہے
میں اردو میں غزل کہتا ہوں ہندی مسکراتی ہے

اچھلتے کھیلتے بچپن میں بیٹا ڈھونڈتی ہوگی
تبھی تو دیکھ کر پوتے کو دادی مسکراتی ہے

تو پھر جا کر کہیں ماں باپ کو کچھ چین پڑتا ہے
کہ جب سسرال سے گھر آ کے بیٹی مسکراتی ہے

(منور رانا)

منور رانا کے ان اشعار کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو غزل میں ہندوستانی تہذیب ماں باپ بہن بھائی کے رشتے، بڑوں کی عزت، چھوٹوں سے پیار جیسے کئی احساسات نمایاں نظر آتے ہیں:

ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے
میں بھی آباد مکاں تھا پہلے

(ناصر کاظمی)

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اسے گھر کر دے

(افتخار عارف)

تاریخ کی نظروں نے وہ دور بھی دیکھا ہے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

(مظفر رزمی)

سفر کیا ہے عجب اہتمام کرتے ہوئے
جہاں سے کوچ وہیں پر قیام کرتے ہوئے

(عرفان صدیقی)

نشانِ سجدہ پہ اپنے بہت غرور نہ کر
وہ نیتوں سے نتیجہ نکال لیتا ہے

(ظفر صہبائی)

کون سی بات کہاں کیسے کہی جاتی ہے
یہ سلیقہ ہو تو ہر بات سنی جاتی ہے

(وسیم بریلوی)

ان اشعار میں ہمیں زندگی کے تمام مسائل نظر آتے ہیں، ہندوستان کی تاریخ، بے مکانی، خوف، انسانیت کی تڑپ، انانیت، خوف کا احساس وغیرہ جیسے تمام احساسات کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہاں غزل سے متعلق مشہور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"تنہائی بہر حال ہمارے دور کی حقیقت اور یہ سرخ، سیاہ، میمنہ، میسرہ کسی ایک تک محدود نہیں۔ انیسویں صدی سے انسانی شخصیت کے اوپر استبداد، ذہنی اور جسمانی کا جو دور شروع ہوا ہے اس کا یقینی نتیجہ یہ ہے کہ ہم روز بروز زندگی کے مصروف تر اور ہنگامہ خیز تر ہوتے جانے کے باوجود زندگی کے عام لمحوں میں کبھی کبھی اور داخلی احساسات کے لمحات میں تقریباً خود کو ہمیشہ اپنے اجداد سے زیادہ تنہا پانے لگے ہیں"۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے اس اقتباس میں غزل کی پوری

معنویت کو واضح کر دیا ہے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ غزل ابتدا سے لے کر آج تک اسی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے کہ اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی سے انکار ممکن ہی نہیں ہے۔ غزل میں ہی وہ خوبی ہے جس میں حال، ماضی اور مستقبل کی مکمل تاریخ نظر آتی ہے میں نے ابھی ولی دکنی سے لے کر، بشیر بدر، منور رانا تک اور ان کے ہم عصروں کے شعر پیش کیے ہیں اب ذرا موجودہ نئی نسل کے کچھ شاعروں کے شعر بھی دیکھیں جن سے ہمیں بہت سی امیدیں وابستہ ہیں اور جن کا مستقبل بھی روشن نظر آتا ہے یقیناً وہ اردو غزل کے مستقبل کو سنوارنے میں ایک اہم رول ادا کریں گے۔۔۔۔

چھوٹے سے ایک فلیٹ میں دنیا سمٹ گئی
جانے کہاں گیا مرا آنگن ہرا بھرا

(سیفی سرونجی)

ابھی دھوپ خالد پے آئی نہ تھی
کہ دیوار دیوار چلنے لگے

(خالد محمود)

بڑھے چلو کہ خبر گرم ہے، ہواؤں نے
حلف اٹھایا ہے بازو ہمارے توڑنے کا

(مظفر حنفی)

سمندر میں جزیرے ہیں جزیروں پر ہے آبادی
ابھی اک شور بس کانوں سے ٹکرانے ہی والا ہے

(خالد عبادی)

میں سوچتا ہوں تو بس سوچتا ہی رہتا ہوں
خیال آتا ہے کیا کیا خیال آتا ہے

(مختار شمیم)

سنا ہے گاؤں کے پیپل کے پاس اس پتھر
بہت دنوں سے مرا انتظار کرتا ہے

(خورشید اکبر)

ان تمام اشعار کو پڑھ کر یہ بات واضح ہے کہ سبھی شاعروں نے اپنے اپنے انداز سے شعر کہے ہیں۔ شاعر کبھی حال کی بات کرتا ہے، کبھی ماضی کی اور کبھی مستقبل کی۔ وہ دوسروں کی زمین پر کھیتی نہیں کرتا وہ اپنی زمین خود بناتا ہے اور شاعر بھی وہی بڑا ہوتا ہے جو خود کی زمین میں شعر کہے۔ آج کی غزل میں انسانی زندگی سے متعلق ہر پہلو کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کئی شاعر تو ایسے رہے ہیں جو خواب میں شعر کہہ لیتے تھے۔ اس سے متعلق شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں...

''زندگی میں کچھ لمحات ایسے ہوتے ہیں جن میں فنکار باطن کی ایک ایسی کرب آمیز جیسی حالت میں پہنچ جاتا ہے جہاں وہ خود کو تجربات و اکتسابات کے باہمی اتصال کی بے چینیوں سے گھرا ہوا پاتا ہے۔ یہی لمحہ ہمارے ماضی اور مستقبل کی نئی تصویریں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ لمحہ ہماری زندگی میں کسی بھی شکل میں آسکتا ہے، دفتر، بازار، سفر یہاں تک کہ خواب کی حالت میں بھی رونما ہوسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ زندگی ہر تخلیق کار کے ساتھ خود بخود جڑی رہتی ہے''۔

اردو غزل کا مستقبل یقیناً روشن تھا روشن ہے اور روشن ہی رہے گا کیونکہ آج کی نسل بہت آگے کی بات سوچ رہی ہے بقول مظفر بھوپالی...

کہہ دو میر و غالب سے ہم بھی شعر کہتے ہیں
وہ صدی تمہاری تھی، یہ صدی ہماری ہے

بے شک یہ صدی نئی نسل کی ہے جو ساری تنقیدی بھول بھلیوں سے دور صرف اپنی تخلیقی توانائی پر بھروسہ کرتی ہے۔ غزل سے متعلق شین کاف نظام کا یہ اقتباس بھی خوب ہے:

'' اصناف شعر میں غزل ایسی صنف ہے جس نے اپنی مروج و مقبول تعریف سے ہمیشہ انحراف کیا ہے۔ چاہیں تو یوں کہہ لیں کہ یہ ایسی صد پہلو صنفِ سخن ہے جس سے ہر تعریف کی تشفی تو ممکن ہے لیکن کوئی تعریف ایسی موجود نہیں جو غزل کے مکمل مزاج و معیار کا احاطہ کر سکے''۔

شین کاف نظام نے کچھ ہی لفظوں میں غزل کی پوری تعریف بیان کر دی ہے۔ اردو غزل کا کارواں یوں ہی رواں دواں رہے گا اور اس کا مستقبل ہمیشہ سے روشن رہے گا۔ بقول شاعر....

اس کے انداز میں رقصاں ہے گلوں کی خوشبو
ختم ہونے کو نہ آئے گا غزل کا موسم

□□□

Stuti Agrawal
Agarwal Jewellers
Sironj-464228 (M.P)

ناولٹ

خیر النساء علیم

پہلا قدم بہار کا

امتحان ختم ہونے کی دیر تھی گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ آہستہ آہستہ مائرہ بھی خوش ہونے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ گھر میں سب کو حد درجہ خوش اور مطمئن دیکھ کر وہ بھی پرسکون ہوگئی تھی۔ امی اور بھابی بھی اب اسے دلچسپی سے تیاریوں میں حصہ لیتے دیکھ کر مطمئن ہوگئیں تھیں...... جواد علی نے ایک آدھ بار اس سے بات بھی کی تھی...... اور مائرہ نے بڑی سنجیدگی سے اس کی ہر بات کو سن لیا تھا...... کیونکہ اس کو جواد علی کا ہی ہمسفر بننا تھا...... یہ اس نے طے کر لیا تھا......

نکاح کے دو بولوں نے زندگی کو ایک نئی جہت سے متعارف کروایا تو ساری توجہ اس طرف مرکوز کر گئی۔ رخصتی کے وقت میکے والوں کو چھوڑ جانے کے دکھ میں آنسو ضرور بہے۔ مگر دل انجانی خوشیوں سے سرشار بھی تھا......

''تم خوش ہونا''...... چلتے چلتے بھابھی نے نہایت تفکر سے پوچھا تھا...... وہ بے اختیار ہاں میں سر ہلا گئی۔ ہاں بھابھی......

''جو مجھے پا کر خوش مجھے بھی اس کے ساتھ پر نازاں ہونا چاہیے''...... خود کو سمجھا کر وہ مطمئن ہوگئی تھی......

جواد کی طبیعت میں کم گوئی بلکہ خاموش طبیعت کا عنصر غالب تھا۔ مائرہ بھی بہت زیادہ باتیں کرنے کی عادی نہیں تھی۔ جوں ہی مہمان گھر سے رخصت ہوئے اسے شدید خاموشی اور تنہائی کا احساس ستانے لگا۔ کبھی کبھار جواد کے والد اس سے کہہ بھی دیتے کہ مائرہ کو کہیں آؤٹنگ کے لیے لے جاؤ۔ وہ تھکے تھکے انداز سے بیوی کی طرف دیکھتا......

''رہنے دیجیے پاپا۔ ابھی بہت تھکے ہوئے آئے ہیں...... ہم کسی چھٹی والے دن چلے جائیں گے''...... چہرہ شناس تو وہ شروع سے ہی تھی۔ جواد خاموشی سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مائرہ بھی اٹھ گئی......

''تم نے پاپا سے میری شکایت کی ہے؟'' اس کے اندر پہنچتے ہی اس نے سوال کر دیا۔ وہ حیران سی رہ گی......

''شکایت! کیسی شکایت''؟

''یہی کہ میں تمہیں وقت نہیں دیتا تمہیں گھمانے پھرانے نہیں لے جاتا''......

نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔ پہلے تو مجھے آپ کی مصروفیت کا اندازہ ہے۔ دوسرے اگر مجھے شکایت ہوتی بھی تو آپ سے ہی کہتی''......

''ہاں! یہی میں بھی تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں''...... تھکے تھکے سے انداز میں وہ بیڈ پر لیٹ گیا۔

''کیا بات ہے آپ بہت ڈسٹرب لگ رہے ہیں کوئی دفتر کی پریشانی ہے''؟ نرم لہجہ کی مٹھاس نے جواد کے دل کو چھوا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا......

''اگر ہے بھی تو تم کیا کر لوگی۔''؟

''مجھ سے بتائیں گے تو کچھ پریشانی کم ہو سکتی ہے''...... وہ رسانیت سے کہنے لگی...... ''اکلوتا ہونے کی وجہ سے مجھے اکیلے رہنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ اپنے غم اور خوشیاں کسی سے بانٹنے کی ضرورت نہیں سمجھتا میں''...... اس نے بات ختم کر دینے والے انداز میں کہا......

جواد کی شخصیت خاصی پیچیدہ تھی۔ جسے سمجھنے کی کوشش میں وہ خود الجھ گئی۔

گو لوگوں کا مسئلہ اصل میں ان کی کم گوئی ہی ہوتا ہے۔ اس کی ضروریات اور اس کی خوشیوں، خواہشوں اور خوابوں سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔

''سچ سچ بتاؤ مائرہ تم میرے ساتھ خوش ہو یا نہیں''...... انداز ایسا تھا جیسے کوئی استاد شاگرد سے سوال کر رہا ہو۔

''آپ کو کیا لگتا ہے آپ نے مجھے خوش رکھا ہے یا ناخوش''؟

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں''۔ جواد کا لہجہ بے تاثر ہو گیا تھا......

''تو یہ میرے سوال کا جواب بھی نہیں''...... اگلے ہی پل وہ کمرے سے نکل گئی......

ایک چھت کے نیچے رہنا اگر خوشگوار ازدواجی زندگی کی علامت ہے تو پھر وہ واقعی خوشگوار زندگی گزار رہے تھے۔ وقت یوں ہی گذرتا رہا۔ کبھی کبھی دونوں ایک دوسرے کے بہت نزدیک آتے اور پھر کبھی ندی کے دو کنارے بن جاتے۔ دونوں ہی ضدی اور لاپرواہ تھے۔ ایک کی مانگنے کی عادت نہیں تھی تو دوسرا مانگے بنا دینے کا عادی نہیں تھا۔ مائرہ کو اپنی ضروریات خواہشات کا اظہار کرنا ہتک اور سبکی محسوس ہوتا۔ تو دوسری طرف جواد اس کے اس طرز عمل سے اور بھی لاپرواہ ہوتا گیا...... یہاں تک کہ معصوم گڑیا بھی دونوں کو قریب نہ لا سکی۔ پھر بھی ان دونوں کے درمیان تعلق کی ایک مضبوط کڑی سی بن گئی۔ گڑیا کا ننھا وجود دونوں کے لیے طمانیت کا باعث بنا......

وقت کا کام ہے گذرنا اور گذرتا ہی رہا۔ گڑیا کی پہلی سالگرہ تھی۔ جس کو بے حد اہتمام اور شاندار طریقہ سے منایا جا رہا تھا۔ سارے انتظامات مکمل ہو گئے تھے۔ جواد تیار ہونے کمرے میں آیا تو مائرہ کو دیکھ کر غصہ سے کھول اٹھا......

''یہ تم نے کیا پہن رکھا ہے؟'' دروازہ بند کرتے ہی ناگواری سے سوال کیا گیا......

مائرہ نے جو ساڑی پہنی ہوئی تھی وہ کئی دفعہ کی پہنی ہوئی اور ڈل کلر کی تھی۔ جس کو دیکھ کر جواد سلگ اٹھا۔

''مائرہ ! آج ہماری بیٹی کی سالگرہ ہے، ایک اہم تقریب ہے ہم سب کے لیے اور تم یہ گھسی پٹی ساڑی پہن کر مہمانوں کا استقبال کرو گی''......

''ہاں ! میں جانتی ہوں سب کچھ۔ ہر ہر موقع پر میں نے اپنے جہیز اور بری کے کپڑوں سے کام چلایا۔ ان ڈھائی سالوں میں عید بقرعید کے موقعوں پر کبھی کسی بڑی تقریب کے لیے کبھی شاپنگ کرائی آپ نے۔ آج بیٹی کی سالگرہ پر بیوی کو فیشن ایبل ڈریس میں دیکھنا چاہتے ہیں آپ! بڑی حیرت کی بات ہے جواد صاحب''...... وہ کہنے پر آئی تو کہتی ہی گئی......

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو، میں امی کو تمھارے اخراجات کے لیے پیسے دیتا تو تھا''...... کتنی دیر بعد وہ کچھ کہہ سکا......

''مجھے میرا حق چاہیے تھا کوئی بھیک نہیں...... آپ نے مجھے اپنے قابل سمجھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ کیا میں آپ کی منکوحہ بیوی نہیں''......

''تم نے کبھی کچھ مانگا ہی نہیں اور میں سمجھا تمھیں میری توجہ، محبت اور میری سنگت کی ضرورت نہیں، مائرہ تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔ تمھارا وہ گریز، وہ اجنبیت؟''

''میں نے زندگی میں اپنے لیے کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا۔ گھر میں میرے کہنے سے پہلے ہی میری ضرورت پوری ہو جاتی تھی۔ شادی کے بعد بھی میں نے یہی سمجھا کہ آپ بنا کہے ہی میری ہر بات جان جایا کریں گے''...... مگر چشم نم سے اس نے جواد کی طرف دیکھا تو وہ اس ''مگر'' سے ہی بہت کچھ سمجھ گیا......

''اتنی چھوٹی سی بات کہنے میں اتنا وقت لگا دیا...... مائرہ!'' قریب آ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بے حد ندامت سے کہہ رہا تھا......

''اتنی چھوٹی سی بات سمجھنے میں آپ نے بھی تو اتنا وقت لگا دیا...... جواد!''

مائرہ کے لہجے میں جانے کیا تھا جواد بے اختیار ہنس دیا۔ اور اسے بازوؤں میں تھام کر محبت سے سرشار لہجے میں کہنے لگا......

''جہاں سے جاگے وہیں سے ہی سویرا ہوتا ہے مائرہ ! اپنے حق کے لیے لڑنا جائز ہے۔ جو لوگ انا کے نام پر پیچھے ہٹ جاتے ہیں وہ بزدلی کی علامت ہوتے ہیں زندگی کے حالات کو موافق بنا کر جینے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہیے۔ ورنہ نقصان تو تم نے دیکھ ہی لیا۔ زندگی کے حسین ترین دن ہم نے اپنی اپنی اناؤں کے خول میں گذار دیے......

مائرہ ایک عالم سرشاری سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی تو وہ بے اختیار ہی شوخ ہو گیا۔ بن پیے ہی بہک رہا تھا...... حیا سے مائرہ کی پلکیں جھک گئیں......

اور جواد کا قہقہہ کمرے میں گونجنے لگا۔

□□□

Khairunnisa Aleem
H.No: 16-2-141/B, Flat No: 301,
Near Officers Mess, Malakpet
Hyderabad. 500036. T.S.

کہانی

زنیرہ ابرار

آدھے دھڑ کے آدمی

پورے گاؤں میں وحشت پھیلی ہوئی تھی۔شام ہوتے ہی سبھی گھروں کے دروازے بند کر دیے جاتے تھے، کھڑکیوں پر کالے پردے ڈالے جاتے، گھروں کے چاروں کونوں اور کھڑکیوں پر دیے جلا کر رکھے جاتے تاکہ اپنے اپنے گھروں کو آفتوں سے محفوظ رکھا جا سکے۔وحشت تھی کہ روز بہ روز بڑھتی ہی جا رہی تھی آئے دن خبریں ملتیں کہ فلاں کا بیٹا، فلاں کا بھائی غائب ہو گیا ہے۔غائب بھی ایسے ہوتے تھے کہ لاکھ ڈھونڈنے پر بھی ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔ان ہی آفتوں سے بچنے کے لیے یہ سب جتن کیے جاتے تھے۔بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ گاؤں میں کسی آسیب کا سایا ہے، کوئی آتما بھٹک کر یہاں آ گئی ہے اور وہی لوگوں کو غائب کر رہی ہے تو کوئی کہتا تھا کہ یہ سب جادو کی وجہ سے ہو رہا ہے کسی نے ہمارے گاؤں پر جادو کیا ہے۔گویا جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔ ’’اسد دروازہ بند کر دو پانچ بج گئے ہیں‘‘۔اماں کی آواز سے اسد چونکا پھر اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے اٹھا۔الماری سے دیے نکالے اور باہر کی طرف چلا گیا کیوں کہ دیے جلانے کے بعد ہی دروازے کو بند کرنا تھا۔

گھڑی کی ٹک۔۔ٹک۔۔ٹک کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔وہ کبھی بستر پر جاتا تو کبھی کرسی پر بیٹھتا ’’کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آخر اس وحشت کے پیچھے کے راز کا پتا کیسے لگایا جائے‘‘۔وہ بڑبڑایا۔اماں سے اس تعلق سے بات کرنا مشکل تھا کیونکہ وہ اس کی بالکل نہیں سنتی الٹا اس کے گھر سے باہر نکلنے پر ہی پابندی لگ جاتی۔دوستوں میں سے بھی کسی سے مدد کی امید نہیں کی جا سکتی۔سوچ سوچ کر اسد کا سر درد کرنے لگا تھا۔وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔تبھی باہر سے زور زور سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آنے لگی۔وہ تیزی سے کرسی سے اٹھا اور کھڑکی کے پاس گیا۔پردہ ہٹا کر کچھ اندازہ لگانا چاہا گلی بالکل سنسان تھی کئی گھروں کے دیے بھی بجھ گئے تھے اور کئی کے بجھنے والے تھے۔کتوں کے بھونکنے کی آواز اگلی گلی سے آ رہی تھی۔وہ یہی سوچ رہا تھا کہ آخر یہ اتنا زور زور سے کیوں بھونک رہے ہیں تبھی رحمان چاچا کی گلی سے کچھ کتے دوڑتے ہوئے آئے اور ان کے آگے یہ کیا۔۔؟ وہ کوئی سایا سا تھا۔ایک کالا سایا جو چلتا ہوا آگے گلی میں داخل ہو گیا۔اس کے پیچھے پیچھے کتے بھی چلے گئے۔اسد کو حیرت ہوئی اور وہ سوچنے لگا کہ اتنی رات کو وہ بھی جب پورے گاؤں میں وحشت پھیلی ہوئی ہے لوگ غائب ہو رہے ہیں ایسے میں یہ کون ہو سکتا ہے۔۔؟ ان ہی سوچوں میں الجھا ہوا وہ بستر تک آیا اور نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔

صبح اماں کی آواز سے آنکھ کھلی۔ایک بار پھر رات کا واقعہ اس کے ذہن میں گھومنے لگا جن سے بمشکل پیچھا چھڑاتے ہوئے وہ بستر سے اٹھا۔فریش ہو کر ناشتہ کیا اور بازار کے لیے نکل گیا کیوں کہ ضرورت کے سامان لانے تھے۔پورا راستہ وہ اسی سائے کے بارے میں سوچتا رہا آخر کار گھر پہنچنے تک وہ ایک فیصلہ کر چکا تھا۔وہ ذہنی طور سے پوری طرح تیار تھا اور بے چینی سے رات کے ہونے کا انتظار کرنے لگا۔باورچی خانے سے پکوڑے کی خوشبو آ رہی تھی کوئی دوسرا دن ہوتا تو وہ دوڑ کر جاتا لیکن آج تو اس کا ذہن کوئی اور ہی گتھی سلجھانے میں لگا ہوا تھا۔پکوڑے کی خوشبو بھی اسے خیالوں کی دنیا سے واپس لانے میں ناکام ثابت ہوئی۔وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کس طرح وہ اسے انجام دے گا۔

گھڑی نے جیسے ہی پانچ بار ٹن۔۔ٹن۔۔۔ٹن بجایا اسد اماں کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کھڑا ہو گیا کیوں کہ یہ تو اب اس کو روز کا معمول بن گیا تھا۔دیے رکھنے کے بعد دروازہ بند کیا اور کھڑکی پر پردہ ڈالتے ہوئے ایک نظر پھیلتے ہوئے اندھیرے پر ڈالی لیکن روز کی طرح آج اس کے دل میں کسی طرح کا خوف نہ تھا بلکہ اس میں ایک طرح کا عزم تھا۔
کھانے کے بعد اماں اپنے کمرے میں چلی گئیں تو اسد بھی اپنے کمرے میں آ گیا اور رات کے گہرے ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

تقریباً رات کے بارہ بج رہے تھے جیسے ہی باہر سے کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دی اسد بستر سے اٹھا اور دبے قدموں سے لابی پار کرتے ہوئے اماں کے کمرے کے پاس جا کر کچھ پل کے لیے رکا اور پوری طرح سے یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ اماں گہری نیند میں ہیں وہ گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔اس نے چادر کو اوڑھ لیا تھا کیوں کہ باہر ہلکی ٹھنڈ تھی اور ایک ٹارچ بھی لے لیا تھا تاکہ ضرورت کے وقت کام آ سکے۔اس نے اپنی گلی پار کی اور آواز کے تعاقب میں آگے بڑھتا گیا۔ٹارچ کو ابھی اس نے جلایا نہیں تھا کیوں کہ چودھویں کی رات تھی اور چاند کی مدھم روشنی میں ہلکا ہلکا دکھائی دے رہا تھا اور گاؤں کی گلیوں اور راستے کا بھی اسے بخوبی علم تھا۔وہ تیز تیز قدموں سے اس سمت چلا جا رہا تھا جدھر سے آواز آ رہی تھی تبھی اس نے سلیم چاچا کی گلی کے نکڑ پر ایک سایا دیکھا اس کے قدم رک گئے۔اس نے گلی کے دوسرے کونے کی آڑ لے کر اس سایے پر اپنی نظریں گڑا دیں۔سایے نے پہلے ٹھہر کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر پرانی حویلی کے راستے کی طرف رخ کیا۔اسد بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو گیا۔سایے نے دوبارہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔پیچھا کرتے ہوئے اسد کے دل پر کبھی کبھی خوف طاری ہو جاتا جس سے فوراً وہ پیچھا چھڑا لیتا۔اسی کیفیت کے ساتھ وہ سایے کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔سایہ حویلی کے قریب پہنچ گیا تھا۔یہاں آ کر سایا کچھ پل کے لیے رکا۔اسد پاس کے درخت کے پیچھے چھپ گیا۔اس بار سایے نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا اور حویلی کے اندر چلا گیا۔

پرانی حویلی کی طرف لوگوں کا بہت ہی کم آنا جانا ہوتا تھا۔گاؤں کے لوگوں کے درمیان اس کی کئی کہانیاں تھیں جسے سن کر پہلے ہی لوگ خوف کے سبب ادھر کم ہی آتے تھے اور رات کے وقت تو کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اسد باہر آیا اور چادر سے اچھی طرح اپنا چہرہ چھپایا اور ہمت کر کے حویلی کے گیٹ کے اندر چلا گیا۔وہ خود کو ہمت دلاتے ہوئے آگے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔حویلی کے چاروں طرف کی زمین خالی تھی شاید پہلے یہاں باغات ہوا کرتے ہوں گے اس نے ایک نظر ان کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا۔گیٹ کے سامنے ایک شاہراہ تھی جو حویلی کے دروازے تک جا کر ختم ہوتی تھی۔اسد شاہراہ پار کر کے حویلی کے دروازے کے پاس پہنچا۔دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔اسد نے اس کی دراڑ سے اندر جھانک کر دیکھا سامنے ایک بڑا سا ہال تھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا اسد کی ہمت بڑھی او روہ اندر داخل ہو گیا۔

حویلی کافی بڑی تھی۔چاروں طرف کمرے بنے ہوئے تھے درمیان میں ایک بڑا ہال تھا۔دیواروں میں جگہ جگہ طاق بنے ہوئے تھے جس میں چراغ جل رہے تھے۔رات اور حویلی میں پھیلے ہوئے سناٹے، چراغ کی مدھم روشنی، یہ سب مل کر ماحول کو پر اسرار بنا رہے تھے۔اسد آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا اور ساتھ ہی ہر کمرے کے دروازے سے جھانک کر اندر دیکھتا۔اس طرح اس نے تقریباً سبھی کمرے دیکھ لیے تھے۔اسے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ سایا اسے کہیں بھی نہیں دکھائی دیا۔وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی وہ جلدی سے پاس کے کمرے میں چلا گیا اور دروازے کے جھروکے پر اپنی آنکھیں گڑا دیں۔آہٹ اور قریب سے آتی ہوئی سنائی دینے لگی۔اس کا سارا بدن پسینے سے تر ہو گیا۔اگلے ہی پل اس نے دیکھا کہ وہ تین سایے تھے جو چلتے ہوئے سامنے کی راہداری میں چلے گئے ہلکی روشنی میں اسے صاف دکھائی نہیں دیا کہ وہ کدھر گئے۔وہ کمرے سے باہر نکلا اور خود کو سنبھالتے ہوئے اس راہداری کی طرف بڑھ گیا۔راہداری کے آخر میں ایک زینہ تھا جو نیچے کی طرف جا رہا تھا۔وہ نیچے گئے ہوں گے یہ سوچ کر وہ بھی زینے سے اترنے لگا۔چادر کو اچھی طرح سے اس نے نیچے تک پھیلا کر اوڑھ لیا اسے لگا کہ اس طرح وہ خود ایک سایے ہی کی طرح دکھنے لگے گا۔نیچے تہہ خانہ تھا۔ایک عجیب طرح

کی بو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں بھی طاقوں میں چراغ جل رہے تھے۔ سامنے ہی کچھ سایے بیٹھے ہوئے دکھائی دیے۔ دبے قدموں سے وہ ان کی نظروں سے بچتے ہوئے ان کے قریب کے ہی ایک ستون کے پیچھے چھپ گیا۔ وہاں سے سب کچھ صاف صاف دکھائی دے رہا تھا اور وہ ان کی باتیں بھی سن سکتا تھا۔

کھٹاک کی آواز کے ساتھ سامنے کے کمرے کا دروازہ کھلا اور تین اور سایے باہر آئے اس میں سے ایک بہت ہی لمبا چوڑا تھا جو آگے تھا اور باقی کے دو سر جھکائے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ اس کو دیکھ کر سبھی سایے اس کی تعظیم میں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اسد کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ ان کا سردار ہے۔ وہ سایہ سبھی سایوں کے درمیان میں آ کر کھڑا ہو گیا اور پھر اس نے اپنا لبادہ اتار دیا۔ سبھی سایوں نے اس کی پیروی کرتے ہوئے اپنا اپنا لبادہ اتار دیا۔ اسد نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ کو بمشکل روکا کیونکہ سامنے جو منظر تھا وہ بڑا ہی خوفناک تھا۔ اس نے دیکھا کہ سبھی سایوں کا آدھا دھڑ غائب تھا۔۔۔ بائیں طرف کا پورا آدھا حصہ۔۔۔ سبھی کی آنکھیں سرخ تھیں ایک طرح کی وحشت ناک۔۔۔ ابلی ہوئیں۔۔۔ باہر کی طرف نکلی ہوئیں۔۔۔ آدھے ہونٹ ایک طرف لٹکے ہوئے تھے۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ حقیقت ہے یا۔۔۔ اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے اس نے اب اپنا دھیان ان کی باتوں پر لگا دیا۔ ان کا سردار ان سے پوچھ رہا تھا۔۔۔ ”اور بتاؤ ہماری مہم کہاں تک پہنچی۔۔۔؟ کتنے نئے لوگ آئے ہیں ہمارے ساتھ۔۔۔؟“ زیادہ تر لوگوں نے اپنے ہاتھ اٹھائے۔ ”واہ۔۔۔ بہت خوب۔۔۔ اتنے سارے۔۔۔ اس کا مطلب کہ ہماری تعداد تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ بہت خوب۔۔۔ تم لوگ اپنی ذمے داری اچھی طرح سے نبھا رہے ہو۔“

اس کے بعد وہ نئے لوگوں سے مخاطب ہو کر بولا کہ ”چلو اب اپنے اپنے بارے میں بتاؤ“۔ ان میں سے ایک نے بولنا شروع کیا ”میرا نام سلیم ہے۔ میری ایک پارچون کی دکان تھی۔ میں گاہکوں کو بے وقوف بنا کر ایکسپائر چیزیں بڑی آسانی سے بیچا کرتا تھا۔ بے ایمانی میری گھٹی میں شامل تھی۔ میں طرح طرح کے حربے اپنا کر لوگوں سے پیسے اینٹھتا تھا۔ اس طرح میں نے بہت سی دولت اکٹھی کر لی تھی۔ اچھے سے گذر بسر ہو رہی تھی کہ ایک رات میں سو رہا تھا کہ اچانک سے میری آنکھ کھل گئی اور مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میرے ایک طرف کا دھڑ بے جان سا ہو گیا ہے اور میں نے دیکھا کہ میری بائیں طرف کا حصہ غائب ہونے لگا۔ پہلے ہاتھ پھر پیر اور پھر پورا آدھا دھڑ۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں اٹھا اور اپنی بیوی کو بھی اٹھانا ہی چاہ رہا تھا کہ سامنے دیوار میں نصب آئینے پر میری نظر گئی۔ اپنی شکل دیکھ کر میں خود ہی ڈر گیا تھا۔ اتنی خوفناک شکل۔۔۔ بیوی بچے دیکھیں گے تو ڈر جائیں گے پھر بہت غور و فکر کے بعد میں نے خودکشی کا ارادہ کر لیا اور اسی غرض سے باہر نکلا۔ ندی کے کنارے پہنچ کر اس میں چھلانگ لگانے ہی والا تھا کہ ’یہ‘ آیا اور اس نے مجھے بچا لیا۔ اس نے ایک کی طرف اشارہ کیا۔ یہ مجھے لے کر آیا اور اس طرح آج میں یہاں ہوں۔“۔۔۔ ”اچھا“ سردار نے ایک لمبی سانس چھوڑی اور ”تم“ پھر اس نے ایک کی طرف اشارہ کیا۔ اسد نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ اس کے ہی گاؤں کے رحیم چاچا تھے۔ گو کہ شکل بگڑنے سے پہچاننا مشکل ہو رہا تھا لیکن پھر بھی اس نے پہچان لیا تھا۔ وہ گویا ہوئے۔۔ ”میں رحیم۔۔۔ جھوٹ، چوری، دغابازی ہی میرا شیوہ تھا۔ میں نے کئی بڑے بڑے گھر میں چوریاں کی اور اس پیسے سے خوب عیاشی بھی کی۔ میں بھی بڑے سکون سے زندگی بسر کر رہا تھا کہ ایک رات اس کی ہی طرح میرے ساتھ بھی ہوا۔ میں نے بھی خود کو ختم کر لینے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ میں نے دکھاوے کی شرافت سے لوگوں کے درمیان بڑی عزت بنائی ہوئی تھی پھر اس چہرے اور اس دھڑ کے ساتھ ان کا سامنا آخر کیسے کرتا۔ اس لیے گھر سے باہر آگ لگا کر خودکشی کا ارادہ کر لیا تھا تاکہ آگ میں جلنے سے کوئی میرا چہرہ پہچان نہ پائے۔ میں نے آگ لگانے کی بھی پوری تیاری کر لی تھی کہ اتنے میں ’یہ‘ آیا اور مجھے سمجھا کر یہاں لے کر آیا۔“ اس طرح ایک کے بعد ایک نے اپنی کہانیاں سنائی۔ اسد حیرت سے سب کو سنتا رہا۔ ان میں اس کے گاؤں کے وہ لوگ بھی تھے جن کے غائب ہونے کی خبریں پھیلی ہوئی تھیں۔ زیادہ تر لوگ عزت اور رسوخ والے تھے لیکن حقیقت میں ان کا اصل چہرہ یہ تھا۔ وہ ان سب کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا کہ ان میں سے ایک نے سردار کو مخاطب کر کے بولا کہ۔۔۔ ”اور آپ“۔۔ ”آپ بھی اپنے بارے میں کچھ بتائیے۔“۔۔ ”میں“۔۔ اسد نے دیکھا کہ سردار کچھ سوچنے لگا اور اس کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ خوفناک ہو گیا تھا۔ اس نے ایک جھرجھری لی۔۔ ”میں“ سردار نے بولنا شروع کیا۔۔۔ ”میں چار بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ میرے ابا نے بہت جائداد چھوڑ رکھی تھی جو اب ہم چاروں بھائیوں کی تھی۔ ایک دن مجھے یہ خیال آیا کہ اگر یہ سب اکیلی میری ہو جائے تو کتنا اچھا ہوگا۔ اگلے ہی لمحے میں نے خود کو جھڑکا اور اس خیال سے پیچھا چھڑانا چاہا کہ نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے بھائی مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ اس رات مجھے نیند نہیں آئی اور ساری رات میں خود سے لڑتا رہا اور آخر میں میرا لالچ جیت گیا اور میں نے

بھائیوں کو مارنے کی سازش رچ لی۔ اگلے دن میں نے انھیں بتایا کہ میں اپنے ایک دوست سے ملنے اس کے گھر جارہا ہوں اور دوست سے ملنے اس کے گھر پہنچ گیا۔ رات کو جب میرا دوست سو گیا تو میں چپکے سے اس کے گھر سے نکل گیا اور اپنے گھر آ گیا۔ باورچی خانے میں گیا اور اس دودھ میں زہر ملا دیا جس کی صبح چائے بننے والی تھی۔ پھر خاموشی کے ساتھ اپنے دوست کے گھر آ کر سو گیا۔ صبح سب کے ایک ساتھ مرنے کی خبر ملی تو میں گھر واپس آیا اور سب کے سامنے زاروزار و قطار رونے لگا لیکن اندر ہی اندر بہت خوش ہوا یہ سوچ کر ہی کہ اب ساری جائداد میری ہے۔ یہی سے میرا لالچ بڑھتا گیا کبھی پیسے کا لالچ، کبھی نئی عورت کا لالچ۔۔۔ غرض اسی طرح کبھی برائیوں نے مجھ میں گھر بنا لیا تھا۔ میں بہت خوش رہتا تھا کیونکہ میں جب بھی اور جو بھی چاہتا اپنی مراد پوری کر لیا کرتا تھا۔ پیسے کی بدولت محلے میں بھی کافی عزت تھی لیکن ایک رات''۔۔۔۔ وہ چپ ہو گیا۔۔۔ پھر کیا ہوا سردار؟۔۔ سب ایک ساتھ بول پڑے۔''ایک رات میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا کہ میرے ساتھ بھی ویسا ہی ہوا جیسا کہ تم لوگوں کے ساتھ ہوا۔ میں بھی خودکشی کے ارادے ہی سے گھر سے نکلا تھا اور ساتھ میں یہ چغہ پہن لیا تھا تاکہ کوئی دیکھ نہ لے۔ میں چلا جارہا تھا کہ راستے میں مجھے یہ حویلی دکھائی دی اور مجھ میں جینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ میں اس حویلی میں چھپ کر رہنے لگا اور آدھی رات کو جب سب سو جاتے تھے تو میں باہر نکلتا تھا۔ ایک دن میں ٹہل رہا تھا کہ میں نے اسے دیکھا۔۔۔ مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی کہ یہ بھی بالکل میری طرح ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے منا کر میں حویلی لے کر آیا۔ اب ہم روز رات کو نکلنے لگے اور آئے دن ہمیں کوئی نہ کوئی ملنے لگا۔ اس طرح ہم لوگوں کی ایک جماعت بن گئی اور آج ہم سینکڑوں کی تعداد میں ہو گئے ہیں۔ ہماری تعداد جتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے مجھے لگ رہا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب ہمیں رہنے کے لیے یہ حویلی بھی چھوٹی پڑ جائے گی کیونکہ جو برائیاں ہم میں تھیں وہ عام انسانوں میں تیزی کے ساتھ شامل ہو رہی ہیں۔ اس کو دیکھتے ہوئے آپ لوگ بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ دن بہت جلدی آئے گا جب لوگوں کی ایک بڑی تعداد آدھے دھڑ کی ہو جائے گی بالکل ہماری طرح آدھے دھڑ کی۔۔۔ تب ہمیں اس طرح چھپ کر نہیں رہنا پڑے گا اور نہ ہی اس لبادے کا سہارا لینا پڑے گا''۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اسد کو اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا محسوس ہوا اور سر چکرانے لگا۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے دبے قدموں سے حویلی کے باہر آ گیا اور آہستہ آہستہ گھر کی طرف رخ کیا لیکن اس کی طبیعت کچھ زیادہ ہی بگڑنے لگی۔ وہ چکرا کر راستے ہی میں گر گیا۔

آنکھ کھلتے ہی اس نے اپنے پاس کچھ لوگوں کو دیکھا۔ صبح ہو چکی تھی۔ اسد سب کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ بار بار وہ اپنی آنکھیں ملتا کیونکہ اسے لگ رہا تھا کہ رہ رہ کر ان کی شکلیں بدل رہی ہیں بالکل آدھے دھڑ کے لوگوں کی طرح۔۔۔ وہ لوگ اس سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے لیکن اس نے صرف اپنے گھر کا پتا بتایا اور گھر تک چھوڑنے کو کہا۔ دو لوگ اسے گھر تک لے آئے۔

اماں بے چینی کے ساتھ تیزی سے میری طرف لپکی۔ ان سے میری حالت دیکھی نہیں جارہی تھی۔ انھوں نے آگے بڑھ کر میرا ماتھا چوما اور پھر سنبھالتے ہوئے میرے کمرے تک لے آئیں۔ جب میں ذرا سنبھلا تو اماں نے پوچھا کہ ''اسد! تم کہاں چلے گئے تھے؟۔۔۔ میں صبح تم کو اٹھانے گئی تو تم اپنے کمرے میں نہیں تھے میں کافی پریشان ہو گئی تھی۔ میں نے تمہارے دوستوں کو بھی کال کیا پر ان سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ایسے کرتے ہیں بیٹا!''۔''وہ اماں!۔۔۔ میں نے سوچا کہ اماں کو بتا ہی دوں اور پھر میں نے ساری روداد کہہ ڈالی۔ اماں حیرت سے میرا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ انھیں میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا پھر وہ میری آنکھیں پھیلا کر ان میں دیکھنے لگی۔ ان کے اس طرح دیکھنے پر میں بولا کہ ''کیا بات ہے اماں؟''۔''رکو۔۔۔ میں ابھی آتی ہوں'' اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گئیں۔ میرا ذہن پھر آدھے دھڑ والوں کی باتوں کی طرف چلا گیا اور میں سوچنے لگا۔ اچانک سے حلیمہ خالہ نے آکر مجھے چونکا دیا۔''چلو بیٹا۔۔۔ باہر چلتے ہیں'' وہ مجھے لے کر آنگن میں آئی۔ وہاں ایک داڑھی والے پیر بابا پہلے سے موجود تھے۔ شاید اماں نے ان سے سب کہا تھا اور پیر بابا کو لانے کے لیے کہا ہوگا۔ پیر بابا نے لوبان جلا کر ایک گھیرے میں مجھے بیٹھایا۔ ہر کوئی خاموش تھا لیکن میرے ذہن میں بہت سے بے ہنگم خیالات کا ایک ہجوم تھا کل کا واقعہ چاہتے ہوئے بھی میرے ذہن سے نہیں نکل رہا تھا۔ پیر بابا دعائیں پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونکتے جارہے تھے اور میرا دھیان اب بھی ان آدھے دھڑ کے لوگوں کی باتوں پر لگا ہوا تھا۔

□□□

Zunera Abrar,
Room No-104,L.H.7
South Campus
Uninivesity of Hyderabad
Ghachibowli
Rngareddy-500046,Telangana

حسن سخن

صبیحہ سنبل

غزلیں

بتاؤں کیا میں کسی کو کہ کیا لگے ہے مجھے
حیات درد کا اک سلسلہ لگے ہے مجھے

قدم قدم پہ لٹا ہے یوں اعتبارِ نظر
وفا بھی اب تو فریبِ وفا لگے ہے مجھے

پکاروں کس کو یہاں آج آدمی کہہ کر
تمام شہر فرشتہ نما لگے ہے مجھے

کہاں کہاں کروں سجدے کسے کسے پوجوں
ہر ایک شخص زمیں کا خدا لگے ہے مجھے

یہ کس مقام پہ لایا ہے میرا حسنِ یقیں
کہ بد دعا بھی کسی کی دعا لگے ہے مجھے

سکوں سے بیٹھی ہوں سنبل میں جس کے سائے میں
اسی درخت کا سایہ گھنا لگے ہے مجھے

گزرے لمحوں کے ورق کھول رہا ہے مجھ میں
کوئی ایسا ہے، جو کچھ بول رہا ہے مجھ میں

کئی برسوں سے جو قیدی مرے پندار میں ہے
اونچی پرواز کے پر تول رہا ہے مجھ میں

ساری آوازیں جو ٹکرا کے پلٹ جاتی ہیں
آہنی شیشے کا خول رہا ہے مجھ میں

اس کے الفاظ بھی پرکیف ہیں شیریں ہے زباں
میٹھی باتوں سے وہ رس گھول رہا ہے مجھ میں

کامرانی ہے کہ بس چھو کے گزر جاتی ہے
ایسا لگتا ہے کوئی جھول رہا ہے مجھ میں

جو بھی اقدار مجھے اپنے بزرگوں سے ملیں
اس وراثت ہی کا بس مول رہا ہے مجھ میں

مصلحت نے تو زباں بند کرادی سنبل
یہی وہ سچ ہے کہ اب بول رہا ہے مجھ میں

Sabiha Sumbul
Flat No. 602, Square Quarter
Maurice Road
Aligarh-202001(U.P)

لذیذ پکوان

کھویا پڈنگ

اجزا: انڈے چار عدد، ڈبل روٹی کے سلائس چھ عدد کنارے کاٹ لیں، دودھ تین کپ، چینی آدھا کپ، کھویا آدھا کپ، زعفران ایک چائے کا چمچ، سبز الائچی ایک چائے کا چمچ پسی ہوئی، بادام حسب ضرورت باریک کٹے ہوئے، چاندی کے ورق حسب ضرورت، مکھن حسب ضرورت

ترکیب: سلائسز کے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر مکھن میں فرائی کر لیں۔ ایک برتن میں دودھ، چینی اور کھویا ڈال کر پکائیں۔ کھویا نرم ہو جائے تو اس میں سلائسز کے ٹکڑے ڈال کر پکائیں۔ تھوڑی دیر بعد اس میں زعفران اور الائچی شامل کر دیں۔

جب گاڑھا ہو جائے تو چولہے سے اتار کر رکھ لیں۔ اب انڈے کو پھینٹ کر اس میں شامل کر دیں۔ اوون پروف ڈش میں مکھن لگائیں۔ یہ آمیزہ ڈش میں ڈال کر سیٹ ہونے تک اوون میں بیک کر لیں۔ اوون سے نکال کر ٹھنڈا کر لیں۔ باریک کٹے ہوئے بادام اور چاندی کے ورق لگا کر پیش کریں۔

چقندر اور سیب کا جوس

چقندر میں وٹامن ''سی'' وافر مقدار میں موجود ہوتا ہے جو اسے پکانے کے دوران ضائع ہو جاتا ہے لہٰذا چقندر کا جوس نکال کر پئیں اور اس کی غذائیت سے فائدہ اٹھائیں۔ اس کے ساتھ سیب کا جوس بھی شامل کر لیں۔ سیب کی افادیت بیان کرنے کی تو یقیناً کوئی ضرورت نہیں کیونکہ سارا زمانہ اس سے واقف ہے۔ چقندر اور سیب کا ذائقہ دار اور صحت بخش جوس بنانے کی سادہ سی ترکیب آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ ان دونوں کا غذائیں بھرا امتزاج آپ کے لیے بہترین مشروب ثابت ہوگا۔

اجزا: چقندر 300 گرام، سیب 200 گرام

ترکیب: چقندر اور سیب کو چھیل کر ان کے ٹکڑے کاٹ لیں۔ بلینڈر میں ان دونوں چیزوں کو پیس کران کا گودا بنائیں اور چھان کر گلاسوں میں بھرلیں۔ مزیدار مشروب تیار ہے۔ اسے تین دن تک فریج میں رکھ کر بھی پیا جاسکتا ہے لیکن فریش بنا کر پئیں تو زیادہ بہتر ہے۔

پین کیک

اجزا: میدہ 2 کپ، چینی ایک کپ، دودھ ایک کپ، بیکنگ پاؤڈر آدھا چائے کا چمچہ، تیل حسب ضرورت، مکھن 2 کھانے کے چمچے، انڈے 2 عدد، ونیلا اسنس چند قطرے، شہد حسب ذائقہ۔

ترکیب: میدہ کو اچھی طرح بیکنگ پاؤڈر کے ساتھ ملا کر چھان لیں۔ اب اس میں چینی، دودھ، انڈے، مکھن اور ونیلا اسنس شامل کر کے اتنا مکس کریں کہ یکجا ہو جائے۔ اب ایک نان اسٹک پین میں تھوڑا سا تیل گرم کریں اور یہی میدہ پین میں ڈال دیں، سنہرا ہو جانے پر دوسری طرف سے بھی سیک لیں۔ اسی طرح تمام پین کیک تیار کریں۔ اوپر سے مکھن کے ساتھ گلیز کر کے گرما گرم چائے کے ساتھ پیش کریں۔

آڑو کا ملک شیک

اجزا: آڑو 10 عدد (چھیل کر ٹکڑے کرلیں)، بادام کی گری آدھا کپ، دودھ دو گلاس، سبز الائچی چار عدد، شہد تین کھانے کے چمچ، کشمش 5 کھانے کے چمچ، چینی 5 کھانے کے چمچ، برف حسب ضرورت۔

ترکیب: دودھ میں سبز الائچی ڈال کر ابال لیں اور اسے فریج میں رکھ کر اچھی طرح ٹھنڈا کرلیں، بادام کی گریاں دو تین گھنٹے پانی میں بھگو کر رکھیں اور پھر ان کا چھلکا اتار لیں، بادام اور کشمش کو گرائنڈر میں ڈالیں اور اس میں دو تین چمچ دودھ ڈال کر اچھی طرح گرائنڈ کرلیں، جب آمیزہ یکجان ہو جائے تو اسے بلینڈنگ جگ میں ڈال دیں، اس میں آڑو کے ٹکڑے کر کے ڈالیں، اس میں شہد، چینی، برف اور دودھ ڈال کر اچھی طرح بلینڈر کریں، ٹھنڈا ٹھنڈا مہمانوں کو سرو کریں۔

بریک فاسٹ برگر

اجزا: ساسجز ڈیڑھ کپ، قیمہ ایک کپ ابلا ہوا، نمک حسب ذائقہ، کالی مرچ حسب ضرورت، انڈے دو عدد، ڈبل روٹی سلائس ایک عدد، برگر بن دو عدد، مکھن حسب ضرورت، چیڈر چیز چار سلائسز

ترکیب: ساسجز سے نکال کر چوپر میں پیس لیں۔ اب اس میں ابلا قیمہ شامل کریں۔ پھر نمک، کالی مرچ، ایک انڈہ، ڈبل روٹی سلائس ڈال کر اچھی طرح مکس کریں اور کباب کی شکل میں فرائی کریں۔ برگر بن کو مکھن لگا کر گرم کریں اور اس پر کباب اور چیڈر چیز رکھیں۔ اس کے بعد ایک انڈہ فرائی کریں اور سلائس پر رکھ کر بن کا دوسرا حصہ رکھیں۔ آخر میں گرم گرم کافی کے ساتھ سرو کریں۔

(بحوالہ: www.meriurdu.com)

محمد اکرم

ہوائی امراض

ہوا انسانی زندگی کا سب سے اہم جز ہے اور اس کے بغیر زندگی ممکن نہیں ہے۔ ہوا اپنی معتدل حالت میں باعث مرض نہیں، یعنی ہوا بذات خود موجب مرض نہیں ہے۔ اس لیے جب ہم ہوائی امراض پر بحث کرتے ہیں تو ان سے مراد ہوا کے سبب ہونے والے امراض نہ ہو کر وہ امراض زیر بحث آتے ہیں جو بالواسطہ طور پر ہوا سے متعلق ہوتے ہیں۔

ہوائی امراض کے ضمن میں وہ بیماریاں آتی ہیں جن کا اصل سبب تو مختلف قسم کے خوردبینی مادے ہوتے ہیں لیکن ان کے پھیلاؤ میں ہوا ایک اہم کردار نبھاتی ہے۔ بنیادی طور پر اس میں وہ امراض شامل نہیں کیے جاتے ہیں، جن کا سبب ہوا میں ہونے والی طبیعی تغیرات ہیں۔ ہوائی امراض کا پھیلاؤ ہوا میں موجود متعدی ماڈوں کے سبب ہوتا ہے جو درج ذیل صورتوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہیں۔

1۔ ہوا میں موجود آبی قطرات

اس ضمن میں شمار ہونے والے آبی قطرات بہت چھوٹے ہوتے ہیں جو ہوا میں تیرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان قطرات کا حجم ایک سے دس مائیکرون تک ہوتا ہے۔ ان قطرات میں متعدی ماڈے اور مریضوں کے کھانسنے چھینکنے کے دوران نکلنے والی رطوبات شامل ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی ان میں مشینوں کے ذریعہ نکلنے والی بھاپ کے اجزا بڑی مقدار میں شامل ہوتے ہیں جن میں حادثاتی طور پر متعدی ماڈے شامل ہوجاتے ہیں اور ہوائی امراض کا سبب بنتے ہیں۔

یہ قطرات ہوا میں کافی مدت تک موجود رہتے ہیں جن میں سے بعض تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غیر موثر ہو جاتے ہیں اور بعض میں تعدیہ پھیلانے کی استعداد کافی عرصہ تک باقی رہتی ہے۔ یہ قطرات نہ صرف ہوا میں تیرتے رہتے ہیں بلکہ ہوا کے بہاؤ کے ساتھ اپنے مبدا سے دور دراز کے علاقوں میں بھی منتشر ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے جو قطرات زیادہ مہین ہوتے ہیں جن کا حجم ایک سے 3 مائیکرون تک ہوتا ہے جو بآسانی پھیپھڑوں کی Alveoli میں داخل ہو جاتے ہیں اور امراض تنفس کا سبب بنتے ہیں۔ اس ذریعہ سے پھیلنے والے امراض کے ضمن میں دق، انف الغزہ، حمیقہ اور خسرہ وغیرہ اہم ہیں۔

2۔ ہوا میں شامل گرد کی صورت میں

انسانوں کے بولنے، کھانسنے یا چھینکنے کے نتیجہ میں جو بڑے سائز کے آبی قطرات خارج ہوتے ہیں جس میں متعدی ماڈوں کی کثرت ہوتی ہے اپنے حجم کی وجہ سے ہوا میں رک نہیں پاتے ہیں اور فرش، فرنیچر، قالین، بستر اور دیگر اشیا پر جمع ہو جاتے ہیں اور خشک ہو کر گرد کے اجزا میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ گرد جھاڑو لگانے، صفائی کرنے، بستر جھاڑنے یا بدلنے کے دوران اڑ کر ہوا میں شامل ہو جاتی ہے اور ہوا کے ساتھ مل کر ایک جگہ سے دوسری جگہ متعدی امراض کے پھیلاؤ کا سبب بنتی ہے۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بھی یہ گرد زمین سے اڑ کر ہوا میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں شامل ہونے والے امراض کے تعلق سے Streptococci، Staphylococci، نمونیہ، دق ریوی Q-fever اور Psittacosis وغیرہ اہم ہیں۔

ہوا میں شامل گرد کے اجزا سانس کے ساتھ تو جسم میں داخل ہوتے ہی ہیں لیکن اکثر اوقات کھانے پینے کی اشیا کو کھلا رکھنے پر یہ گرد ان کے اوپر جمع ہو جاتی ہے اور تعدیہ اور متعدی ہوائی امراض کا سبب بنتی ہے۔

3۔ بلا واسطہ متعدی مادّوں کا پھیلاؤ

اس ضمن میں وہ امراض آتے ہیں جن کے پھیلاؤ میں ہوا کا کردار بہت معمولی ہوتا ہے اور متعدی مادّے ایک شخص سے دوسرے شخص میں براہ راست منتقل ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کھانستا یا چھینکتا ہے تو اس عمل کے دوران اس کے دہن اور پھیپھڑوں کی رطوبات باریک قطرات کی ایک پھوہار کی شکل میں باہر آتی ہیں اور اگر وہ شخص کسی مرض میں مبتلا ہے تو اس مرض کے متعدی مادّے بھی ان قطرات میں شامل ہوتے ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی دوسرا شخص اس کے سامنے آ جاتا ہے تو یہ قطرات سیدھے طور پر اس کی سانس یا منہ میں داخل ہو جاتے ہیں اور امراض کے پھیلاؤ کا سبب بنتے ہیں۔

ذیل میں مخصوص ہوائی امراض کا مختصر تعارف اور تحفظی اقدامات پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان امراض کے اسباب علامات اصول علاج و علاج پر مفصل بحث کے لیے معالجات کی کتابوں کو رجوع کیا جا سکتا ہے۔

جدری (Smallpox)

ایک حاد متعدی مرض ہے جو Variola نام کے وائرس کے سبب ہوتا ہے۔ اس مرض میں اچانک تیز بخار کے ساتھ سر میں درد، کمر درد، قے اور کبھی کبھی دورہ پڑنے کی شکایت بھی ملتی ہے۔ خصوصی طور پر بچوں میں بخار کے تیسرے دن ایک مخصوص قسم کے دانے جسم پر نمودار ہوتے ہیں جو ایک مخصوص بعید از مرکز (Centrifugal) طریقے پر پھیلتے ہیں یعنی جسم کے درمیان سے شروع ہو کر اطراف کی جانب بڑھتے ہیں۔ ان دانوں کے پانچ درجات یعنی میکیول، پیپول، ویسائکل، پسچول اور آخری کھرنڈ کی شکل میں Scabs بن کر جھڑ جاتے ہیں۔

آج کی تاریخ میں اس بیماری کا مکمل انسداد ہو چکا ہے، 8 مئی 1980 کو عالمی ادارہ صحت نے اعلان کر دیا کہ اب یہ بیماری عالمی پیمانے پر ختم ہو چکی ہے، ساتھ ہی ساتھ اس کے متعلقہ حوالہ جات کو بھی ختم کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ 1982 میں عالمی ادارۂ صحت کے تمام ممبر ممالک نے اس مرض کی تلقیح کے استعمال کو ترک کر دیا۔ ہندوستان میں 1997 میں انسداد جدری کی بیسویں سالگرہ منائی گئی۔ اس مرض کے اصل سبب Variola Virus کو Russian Fedration اور امریکہ کے سرکاری تحقیقی ادارے میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ ہوا کے ذریعہ پھیلنے والے امراض کی فہرست میں یہ مرض کافی مدت تک نمایاں مقام پر رہا، کیونکہ اس کے عوارضات اور چہرے پر اس کے ذریعہ چھوڑے جانے والے بدنما داغ آج بھی اس کی حشر سامانیوں کی یاد دلاتے ہیں۔

حمیقا (Chicken Pox)

یہ جدری سے مشابہ ایک متعدی ہوائی مرض ہے جس کا اصل سبب Varicella Zoster وائرس ہے جس کو Human (Alpha) Herps Virus-3 بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی مدت حضانت 14 سے 16 دن ہوتی ہے لیکن بعض اوقات یہ 7 سے 21 دن تک ہو سکتی ہے۔ یہ وائرس ناک اور منہ کی رطوبات کے ساتھ کھانسنے اور چھینکنے پر آبی قطرات کی شکل میں ایک شخص سے دوسرے میں منتقل ہوتے ہیں۔ یہ وائرس حاملہ عورت سے مشیمہ Placenta کے راستے نوزائدہ بچے میں بھی منتقل ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے بچوں میں خلقی حمیقا Congenital Varicella نام کی بیماری دیکھنے کو ملتی ہے۔

اس مرض میں تیز بخار کے ساتھ جسم پر دانے نکلتے ہیں اور کمر میں درد کی شکایت ہوتی ہے۔ اس مرض کے دانے مخصوص آبلہ نما Vesicular شکل کے ہوتے ہیں۔ مریض کی ناک کی غشاء مخاطی میں اس مرض کے وائرس زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ یہ وائرس دانے نکلنے کے ایک یا دو دن پہلے سے شروع ہو کر 5-4 دن بعد تک دوسرے اشخاص میں تعدیہ کا سبب بنتے ہیں۔ یہ مرض دس سال سے کم عمر کے بچوں میں زیادہ عام ہوتا ہے۔ اس مرض میں ایک بار مبتلا ہونے پر جسم کی قوت مدافعت اور قوت مناعت جوش میں آتی ہے اور ضروری خلیات تیار کر لیتی ہے، جس کے سبب جسم میں تاحیات مناعت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا دوسری بار حملہ شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس مرض سے تحفظ کے لیے مریض کو علیحدگی میں رکھا جانا چاہیے اور کپڑے، بستر اور دیگر اشیا کو جس میں ناک اور منہ کی رطوبات شامل ہوں اچھی طرح مطہر کرنا چاہیے۔

اس مرض سے تحفظ کے لیے تعدیہ کے 72 گھنٹوں کے اندر Varicella Zoster Immunoglobulin دی جانی چاہیے اس کی مقدار خوراک کم سے کم 1.25ml اور زیادہ سے زیادہ 5ml ہوتی ہے جس کو بین العضلی انجکشن کی شکل میں دیا جاتا ہے۔

اس مرض کے پھیلاؤ کی صورت میں Varicella Virus کی مخصوص تلقیح 0.5 ml تحت الجلد انجکشن کی صورت میں ایک سے بارہ سال تک کے بچوں کو ایک خوراک دی جاتی ہے۔ بارہ سال سے زیادہ عمر والوں کو 6 سے 10 ہفتہ کے وقفہ پر دو خوراکیں دی جاتی ہیں۔ جاپان کے تاکاہاشی نام کے سائنسدان نے 1970 میں OKA Strain سے

زندہ تلقیح تیار کی تھی جس کو امریکہ کے FDA نے 1995 میں مستند تلقیح قرار دیا۔ اس کے علاوہ اس کی ایک مرکب تلقیح MMRV کے نام سے دستیاب ہے جس میں خسرہ، گلسوا، اور ربیلہ کے ساتھ حمیقا کے زندہ تخفیف شدہ وائرس بھی شامل کیے گئے ہیں تاکہ بچوں میں اس کو بآسانی استعمال کرایا جاسکے۔

خسرہ (Measles)

اس مرض کو حصبہ کے نام سے بھی بیان کیا جاتا ہے اس کا اصل سبب RNA Paramyxovirus ہوتا ہے جس کی مدت حضانت سات سے دس دن ہوتی ہے۔ اس مرض کی وضاحت سب سے پہلے طب یونانی کی مشہور شخصیت ابوبکر محمد بن زکریا رازی نے ''الجدری والحصبہ'' نام کی کتاب میں کیا۔ اس مرض کا وائرس انسانی جسم کے باہر زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ پاتا ہے اس لیے یہ زیادہ تر حصبہ کے مریض آبی قطرات کی شکل میں دوسرے لوگوں میں منتقل ہوتا ہے۔

اس مرض میں بخار، کھانسی اور نزلہ کے ساتھ مخصوص maculopapular قسم کے دانے نکلتے ہیں۔ یہ مرض کسی بھی موسم میں ہوسکتا ہے، لیکن اکثر گرم ممالک میں یہ سردی کے موسم میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک شخص سے دوسرے شخص میں یہ آبی قطرات کی شکل میں منتقل ہوتا ہے۔ اس مرض کے تحفظ کے لیے زندہ تلقیح کی ایک خوراک 9 ماہ کی عمر میں تحت الجلد انجکشن کی شکل میں 0.5ml دی جاتی ہے۔ یہ تلقیح برودت کے ذریعہ خشک کیے گئے سفوف کی شکل میں ہوتی ہے جس کو استعمال کے وقت مجوزہ محلول کے ساتھ حل کیا جاتا ہے۔ 9 ماہ سے کم عمر میں یہ تلقیح موثر ثابت نہیں ہوتی ہے کیونکہ اس عمر تک بچے کے جسم میں خلقی طور پر موجود طبعی ضد اجسام اس تلقیح سے نبرد آزماں ہوکر اسے غیر موثر کردیتی ہیں۔ لیکن خسرہ کی وبا کی صورت میں 6 ماہ کی عمر میں ہی یہ تلقیح دی جاتی ہے اور بچے کی عمر 9 ماہ ہونے پر اس کی دوسری اضافی خوراک دی جاتی ہے۔ ان ممالک میں جہاں یہ مرض زیادہ نہیں پایا جاتا ہے اس تلقیح کو 15 ماہ کی عمر میں دیا جاتا ہے تاکہ خلقی ضد اجسام کے ذریعہ اس کے غیر موثر ہونے کا امکان بالکل ختم ہوجائے۔

اس کے علاوہ مخلوط تلقیح MMR جس میں Measles, Mumps اور Rubella کی ایک خوراک 0.5ml تحت الجلد یا بین العضلی انجکشن کی شکل میں دی جاتی ہے۔ اس ضمن میں ایک اور تلقیح MMRV شامل ہے جس میں جملہ تین امراض کے ساتھ ساتھ حمیقاء Varicella کے خلاف بھی مناعت پیدا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے،

اس کے علاوہ ایک دو رکنی تلقیح MR بھی مستعمل ہے جو Measles اور Rubella کے خلاف مناعت پیدا کرتی ہے۔ تعدیہ ہونے کی صورت میں مفعولی مناعت کو طور پر مخصوص Immunoglobulin تین سے چار دن کے اندر دی جاتی ہیں۔

جرمن خسرہ (Rubella or German Measles)

یہ بھی خسرہ کی طرح کا ہی مرض ہے جس کا سبب خاص Togavirus کے خاندان کا ایک RNA وائرس ہوتا ہے جس کی مدت حضانت دو سے تین ہفتے (اوسطاً 18 دن) ہوتی ہے۔ یہ وائرس مریض کے ناک، حلق، خون، CSF اور پیشاب میں پایا جاتا ہے۔ یہ آبی قطرات کی شکل میں ایک شخص سے دوسرے میں منتقل ہوتا ہے۔ اس مرض میں کھانسی، نزلہ، زکام کے ساتھ خفیف بخار ہوتا ہے اور Maculopapular دانے نکلتے ہیں ساتھ ہی غدود لمفاویہ متورم ہوجاتے ہیں۔

اس مرض کا ایک بار حملہ ہونے پر تاعمر مناعت حاصل ہوجاتی ہے اور اس کا دوسرا حملہ شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس سے تحفظ کے لیے اوپر بیان کی گئی MMR تلقیح کے علاوہ ایک زندہ تلقیح Rubella Vaccine (RA 27/3) کے نام سے بھی دستیاب ہے جو 1979 میں تیار کی گئی تھی۔ اس کی 0.5ml کی ایک خوراک ایک سال سے بڑے بچوں کو تحت الجلد انجکشن کی شکل میں دی جاتی ہے۔ اس کو ایک سال سے کم عمر کے بچوں اور حاملہ عورتوں کو نہیں دیا جانا چاہیے۔ حاملہ عورتوں میں اس کے استعمال سے Congenital Rubella Syndrome خلقی ربیلہ سنڈروم ہوسکتا ہے۔ اس تلقیح کے استعمال کے تین ماہ بعد تک حمل سے پرہیز کرنا چاہیے۔

گزشتہ 20 سال کے تجربہ کی بنیاد پر اس تلقیح کے استعمال کا لائحہ عمل اس طرح متعین کیا گیا ہے۔ اس میں سب سے پہلے بچے پیدا کرنے کی عمر والی عورتوں (15 سے 34 یا 39 سال) کو اس مرض سے محفوظ رکھنے کو ترجیح دی جائے اور اس کے بعد اس مرض کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے 1-14 سال کے سبھی بچوں کو یہ تلقیح استعمال کرائی جائے اور آخر میں ایک سال کے بچوں کو عمومی تمنیع پروگرام کے تحت تلقیح دی جائے۔

ورم اصل الاذن (Mumps)

اس مرض کو کنپھیڑ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس کا سبب خاص Myxovirus Parotiditis نام کا ایک RNA وائرس ہوتا ہے جو خصوصی طور پر غدد اور اعصاب کو متاثر کرتا ہے۔ اس کی مدت حضانت دو

سے تین ہفتے (اوسطاً18 دن) ہوتی ہے۔

اس مرض میں غیر سدیدی طور پر کسی ایک یا دونوں جانب کی Parotid Glands متورم ہوجاتی ہیں جس کے ساتھ بخار، سر درد بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے تحفظ کے لیے مذکورہ بالاMMR کے علاوہ Mumps Vaccine نام کی ایک زندہ تلقیح کی ایک خوراک 0.5ml بین العضلی انجکشن کی شکل میں ایک سال سے زائد عمر کے بچوں کو دی جاتی ہے۔

انف العنزہ (Influenza)

اس مرض کو نزلہ وبائیہ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس مرض کا سبب خاص Orthomyxoviridae خاندان کا Influenza وائرس ہوتا ہے۔ جس کی تین اقسام زیادہ تر دیکھنے کو ملتی ہیں جنھیں ہم A یا H1N1، B یا H2N2 اور C یا H5N1 کے نام سے جانتے ہیں۔ اس مرض کی مدت حضانت 18 سے 72 گھنٹے ہوتی ہے۔

اس مرض سے تحفظ کے لیے رہائشی مکانوں اور اجتماعی مقامات کے تہویہ کو بہتر بنانا کافی مفید ہوتا ہے۔ اس مرض کے وبائی پھیلاؤ کی صورت میں بھیڑ والے مقامات پر جانے سے پرہیز اور منھ و ناک کو ڈھانکنے کے لیے رومال یا ماسک کا استعمال کرنا چاہیے۔ اس کے سبب خاص میں مستقل بدلاؤ اور پھیلاؤ کے مدنظر کوئی ایک تلقیح مستقل طور پر کارگر ثابت نہیں ہوتی ہے اور اس میں مسلسل تحقیقات جاری ہیں۔ عمومی طور پر رائج تلقیحات کے ضمن میں مردہ وائرس سے تیار شدہ Influenza Vaccine دستیاب ہے، جس کی عام طور پر 0.5 ml کی ایک خوراک تحت الجلد انجکشن کی شکل میں دی جاتی ہے۔ ایسے افراد جن میں کسی سابقہ تمنیعی تجربہ کی روداد نہیں ملتی ہے ان میں اس کی دو خوراکیں 3 یا4 ہفتہ کے وقفہ سے دی جاتی ہیں۔ اس تلقیح کے استعمال پر بخار، مقامی سوزش دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس میں بہت شاذ ایک مخصوص علت گلین بارے سنڈروم Guillain Barre Syndrome جو کہ ایک قسم کا فالج Ascending Paralysis دیکھنے کو ملتا ہے۔

اس مرض سے تحفظ کے لیے ایک زندہ تلقیح ناک میں ڈالنے والے قطرات کی شکل میں دستیاب ہے جس کے ذریعہ مقامی اور عمومی دونوں قسم کی مناعت پیدا ہوتی ہے۔ جدید تلقیحات کے ضمن میں SPLIT وائرس تلقیح تیار کی گئی ہے جو ایک اعلیٰ درجہ کی مطہر کی گئی تلقیح ہے جس میں عوارضات بہت کم ہوتے ہیں اور یہ روایتی مکمل وائرس تلقیح سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اور Nuraminidase Specific Vaccine نیورامنیڈیز مخصوص تلقیح شامل کی گئی ہے جس میں وائرس کا صرف ایک مخصوص جز N-antigen ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ حاصل شدہ ضد اجسام نہ صرف وائرس کی تعداد کم کرتی ہیں بلکہ ان کے پھیلاؤ کو بھی محدود کرتی ہیں۔ اس ضمن میں مزید تحقیقات جاری ہیں اور زیادہ بہتر تلقیحات تیار کرنے کی مسلسل کوشش کی جارہی ہے۔

خناق (Diphtheria)

یہ متعدی مرض ذبحہ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس بیماری کا سبب خاص Corynebacterium Diphtheriae نام کا ایک جرثومہ ہوتا ہے جس کی مدت حضانت 2 سے 6 دن ہوتی ہے۔ اس جرثومہ کی تین اقسام پائی جاتی ہیں جنھیں Gravis, Mitis اور Intermedius کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ جراثیم عموماً حلق میں نشو ونما پاتے ہیں اور خارجی سمّیت Exotoxin کے ذریعہ مرض پیدا کرتے ہیں جس میں ایک مخصوص جھلی 'غشاء کاذب' بن جاتی ہے، جس کی وجہ سے تنفس میں دشواری اور دیگر علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ اس کی سمّیت قلب اور نظام اعصاب کو بھی متاثر کرسکتی ہے جس کے نتیجہ میں Myocarditis اور Paralysis جیسے عوارضات بھی ہوسکتے ہیں۔ یہ مرض عموماً آبی قطرات کی شکل میں ایک سے دوسرے میں منتقل ہوتا ہے۔ اس مرض میں خفیف بخار، حلق میں سوزش، نگلنے میں تکلیف اور آواز میں بھاری پن کے ساتھ کھانسی کی شکایت ہوتی ہے۔

اس مرض سے تحفظ کے لیے عام طور پر DPT تلقیح کا استعمال کیا جاتا ہے، جس کی 0.5ml کی تین خوراکیں چھ، دس اور چودہ ہفتے کی عمر پر بین العضلی انجکشن کی صورت میں دی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ڈیڑھ سال کی عمر میں ایک بوسٹر خوراک دی جاتی ہے۔ پانچ سال سے زیادہ عمر کے بچوں کو DT تلقیح دی جاتی ہے جس میں صرف خناق اور کزاز کے toxoid شامل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور تلقیح DT کے نام سے دستیاب ہے جس کو بالغ افراد میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مفرد خناق تلقیح کی مختلف شکلیں بازار میں دستیاب ہیں جس میں FT (فارمل ٹوکسائڈ)، APT (ایلم پریسی پٹیٹڈ ٹوکسائڈ)، PTAP (پیوریفائڈ ٹوکسائڈ ایلمونیم فاسفیٹ)، PTAH (پیوریفائڈ ٹوکسائڈ ایلمونیم ہائڈر آکسائڈ) اور TAF (ٹوکسائڈ اینٹی ٹوکسن فلوکیولز) شامل ہیں لیکن ان تلقیحات کو زیادہ کثرت سے استعمال نہیں کیا جاتا ہے۔

فاعلی مناعت کے لیے مستعمل تلقیحات کے علاوہ مفعولی مناعت کے ذریعہ بھی اس مرض سے تحفظ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں خناق کا Antitoxin جس کو گھوڑے کے Serum میں تیار کیا جاتا ہے

کافی مفید ہوتا ہے اس کو نہ صرف تحفظ بلکہ علاج کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ تحفظی اقدامات کے طور پر اس کی 500 سے 2000 units تحت الجلد یا بین العضلی انجکشن کی صورت میں دی جاتی ہیں۔

شہیقہ (Pertussis)

اس مرض کو Whooping Cough یا کالی کھانسی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے کیونکہ اس کھانسی میں شہیق کے وقت مرغ کی بانگ جیسی آواز آتی ہے۔ اس مرض کا سبب خاص Bordetella Pertussis ہوتا ہے جس کی مدت حضانت 7 سے 14 دن ہوتی ہے۔ بعض افراد میں اس مرض کا سبب Bordetella Parapertussis بھی ہوسکتا ہے۔ یہ جرثومہ انسانی جسم کے باہر زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ پاتا ہے۔ چین میں اس مرض کو 'سو دن کی کھانسی' کہا جاتا ہے۔ عموماً یہ مرض آبی قطرات کی شکل میں پھیلتا ہے۔ مریض کے کھانسنے، چھینکنے یا بولنے کے دوران یہ جراثیم ہوا میں شامل ہوجاتے ہیں اور دوسرے افراد کو متاثر کرتے ہیں۔

اس میں خفیف بخار کے ساتھ کھانسی کی شروعات ہوتی ہے جو بعد میں کھانسی کے دورہ میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ اس مرض سے تحفظ کے لیے بھی DPT تلقیح کا استعمال کیا جاتا ہے جس کی 0.5ml کی تین خوراکیں چھ، دس اور چودہ ہفتے کی عمر پر بین العضلی انجکشن کی شکل میں دی جاتی ہیں اور ڈیڑھ سال کی عمر میں ایک بوسٹر خوراک دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک مردہ تلقیح بھی موجود ہے جو صرف شہیقہ کے خلاف مناعت پیدا کرتی ہے۔

سرسام دموی (Meningiococcal Meningitis)

اس کا سبب خاص N. meningitidis ہے جس کی کئی اقسام پائی جاتی ہیں مثلاً Group A, B, C, D, X, Y, 29E اور W135 وغیرہ۔ ان میں سے Group A, C اور کچھ حد تک B اکثر اوقات وبائی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس مرض کی مدت حضانت عموماً تین چار دن ہوتی ہے لیکن یہ 2 دن سے 10 دن تک ہوسکتی ہے۔

اس مرض میں اچانک شدید سر درد، بخار، متلی، قے، گردن میں سختی کے ساتھ روشنی سے تکلیف کی شکایت ہوتی ہے۔ اس مرض سے تحفظ کے لیے مفرد اور مرکب دونوں قسم کی تلقیحات رائج ہیں جس میں ایک رکنی تلقیحات Group A, C, Y اور W135 اقسام پر مبنی ہوتی ہیں۔ اس مرض کے لیے مرکب تلقیحات Group A & C, Group A-C-Y وغیرہ رائج ہیں جن کی 0.5ml کی ایک خوراک تحت الجلد انجکشن یا بین العضلی انجکشن کی صورت میں دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بچوں میں ایک رکنی تلقیح (Serogroup C conjugate vaccine) استعمال کی جاتی ہے۔

دق (Tuberculosis)

عمومی طور پر ٹی بی کے نام سے موسوم اس مرض کا سبب خاص Mycobacterium Tuberculosis نام کا جرثومہ ہے۔ اس مرض کی مدت حضانت عمومی طور پر 3 سے 6 ہفتہ ہوتی ہے لیکن یہ کئی ہفتوں سے لے کر کچھ ماہ یا سال تک بھی ہوسکتی ہے۔

یہ ایک مزمن مرض ہے جس میں مختلف قسم کی علامات پائی جاتی ہیں جس میں طویل مدت تک بخار، کھانسی اور جسمانی وزن میں کمی خاص علامات ہیں۔ اس مرض سے تحفظ کے لیے BCG (Bacille Calmette Guerine) نام کی تلقیح کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس تلقیح کی ایجاد کالمیٹ اور گویرین نام کے دو سائنسدانوں نے کی تھی، انھیں کے نام کی مناسبت سے اس تلقیح کو BCG کہا جاتا ہے۔ اس کی ایک خوراک پیدائش کے دن یا 6 ہفتہ کی عمر میں دی جاتی ہے۔ اس تلقیح کی 0.1ml خوراک جلد کے دو طبقات کے درمیان Intradermal انجکشن کی صورت میں دی جاتی ہے۔ یہ انجکشن عضلہ ذالیہ (Deltoid) پر لگایا جاتا ہے جس کے لیے بائیں ہاتھ کو مقرر کیا گیا ہے تاکہ اس کے نشان کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکے کی اس بچے کو BCG کا ٹیکہ دیا جاچکا ہے۔

جمرہ (Anthrax)

اس مرض کا سبب خاص Bacillus Anthracis نام کا جرثومہ ہے۔ یہ مرض تین شکلوں یعنی جلدی، ریوی اور معوی میں وارد ہوتا ہے اس میں سے جلدی جمرہ کی مدت حضانت ایک دن، ریوی جمرہ کی ایک سے سات دن جو زیادہ سے زیادہ 60 دن ہوسکتی ہے۔ معوی جمرہ کی مدت حضانت ایک سے سات دن ہوتی ہے۔

اس مرض میں بخار، غنودگی، ہلکی کھانسی، سینہ میں درد اور تنگی تنفس کی شکایات پائی جاتی ہیں۔ اس مرض سے تحفظ کے لیے تلقیحات موجود ہیں لیکن عمومی طور استعمال نہیں کی جاتی ہیں صرف مخصوص لیب میں کام کرنے والوں یا جانوروں کے علاج ومعالجہ سے منسلک افراد میں ہی اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں AVA (Anthrax Vaccine Adsorbbed) تلقیح کی پانچ خوراکیں بین العضلی انجکشن کی شکل میں دی جاتی ہیں اور ہر سال ایک بوسٹر خوراک دی جاتی ہے۔

طاعون(Plague)

اس مرض کا سبب خاص Yersinia Pestis ہوتا ہے جو تین طرح سے متاثر کرتا ہے یعنی Bubonic، Septicaemic اور Pneumonic طاعون۔ اس میں سے پہلی دو اقسام کی مدت حضانت دو سے سات دن اور ریوی طاعون کی مدت حضانت ایک سے تین دن ہوتی ہے۔ ہندوستان میں اس مرض کے لئے موافق وقت ستمبر سے مئی تک ہوتا ہے۔ اس مرض کے پھیلاؤ میں چوہوں کے جسم پر پلنے والے پسّو (X cheopis) خاص طور سے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

تعدیہ تنفس (Acute Respiratory Infection)

انسانوں میں تنفّسی تعدیہ بہت عام ہے جس کا سبب عموماً ہوا کے ذریعہ پھیلنے والے متعدی ماڈے ہوتے ہیں۔ اس مرض میں آلات تنفس متورم ہوجاتے ہیں اور یہ ورم ناک سے لے کر ریہ کی خشنہ Alveoli تک کسی بھی حصہ میں ہوسکتا ہے۔ اس ضمن میں اگر بالائی حصہ میں ورم ہے تو سردی، نزلہ، زکام، التہاب اور کان میں درد جیسی علامات ملتی ہیں۔ جب کہ آلات تنفس کے زیریں حصہ میں ورم کی صورت میں کھانسی، ناک کا بہنا، حلق میں درد، سانس لینے میں دشواری وغیرہ عام شکایات ہوتی ہیں اور ساتھ ہی عموماً بخار بھی ہوتا ہے۔

اس مرض کے اسباب کے ضمن میں مختلف جراثیم شامل ہوتے ہیں جس میں شہیقہ، خناق اور انف العنزہ کے جراثیم کے علاوہ Klebsiell Pneumoni، Legionella Pneumophila، Streptococcus، Staphylococcus Pyogenes Streptococcus Pyogenes اور Pneumoniae وغیرہ اہم ہیں۔ اس کے علاوہ بعض Adenovirus، خسرہ، Influenza-A,B,C، Enteroviruses، Respiratory Syncytial، Parainfluenza-1,2,3 Virus، Rhinoviruses اور Coronaviruses بھی اس کے اہم اسباب ہیں۔ اس کے ساتھ ہی Chlamydia، Type-B، Coxiella Buratti اور Mycoplasma Pneumoniae بھی انسانوں میں تعدیہ تنفس حاد کا سبب بنتے ہیں۔

اس مرض سے تحفظ کے لیے اسباب ممدہ پر خصوصی توجہ دینی چاہیے جس میں بہتر تہویہ، بہتر تغذیہ اور ہوائی آلودگی کی روک تھام اس مرض سے بہتر طور پر تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی بہتر تمنیع اور بعد از ولادت زچہ و بچہ کی بہتر نگہداشت اس سلسلہ میں کافی مفید ثابت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں 1990 میں تعدیہ تنفس حاد کا کنٹرول پروگرام ایک عارضی Pilot پروجیکٹ کے طور پر شروع ہوا تھا اس کے بعد 1992 سے یہ چائلڈ سروائیول اینڈ سیف مدر ہڈ Child Survival & Safe Motherhood پروگرام کے تحت عمل پیرا ہے۔

ہوائی امراض کے عمومی تحفظی اقدامات

مذکورہ بالا ہوائی امراض کے مخصوص تحفظی اقدامات کے علاوہ کچھ عمومی تدابیر جو اس قسم کے امراض سے بہتر تحفظ فراہم کرتی ہیں درج ذیل ہیں۔

1۔ ہوا میں متعدی ماڈوں کی شمولیت پر ہر ممکن روک لگائیں۔ خصوصی طور پر اسپتالوں اور دیگر ایسی جگہوں جہاں پر مریضوں کی جسمانی رطوبات، سدید یا فضلات وغیرہ خشک حالت میں موجود ہونے کے امکان ہوں وہاں پر صفائی یا جھاڑو لگانے کے لیے روایتی طریقے استعمال نہ کیے جائیں جس سے متعدی ماڈے ہوا میں شامل ہوسکیں۔ اس ضمن میں Vaccume Cleaner کا استعمال مفید ہوتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو اس قسم کے فضلات و مرضی ماڈوں کو پہلے مناسب دافع تعفن اشیا سے مطہر کر لیا جائے اور اس کے بعد صفائی کی جائے۔

2۔ تہویہ کا نظام درست رکھیں اور ہوا کی آمد و رفت کے لیے مناسب کھڑکیاں اور روشندان وغیرہ بنائیں۔ کیونکہ مناسب تہویہ سے ہوا کے اندر شامل متعدی ماڈوں کی تعداد میں تخفیف ہوجاتی ہے اور ہوائی امراض کے امکان کم ہوجاتے ہیں۔ اگر مکانوں میں صاف ہوا کا گزر مناسب طریقہ سے ہو رہا ہے تو ہوا آسانی سے مکدر نہیں ہو پاتی ہے اور اور اس میں مرض پیدا کرنے والے ماڈوں کی شرح بھی کم ہوتی ہے۔

3۔ کھانستے یا چھینکتے وقت خاص طور پر جب کوئی شخص کسی مرض میں مبتلا ہے تو اس کو اپنے منہ اور ناک کو کسی رومال سے ڈھانک لینا چاہیے تا کہ متعدی ماڈہ ہوا میں داخل نہ ہو یا سیدھے طور پر کسی دوسرے شخص کے جسم میں داخل نہ ہو۔

(ماخوذ: حفظان صحت، سنہ اشاعت 2018، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)

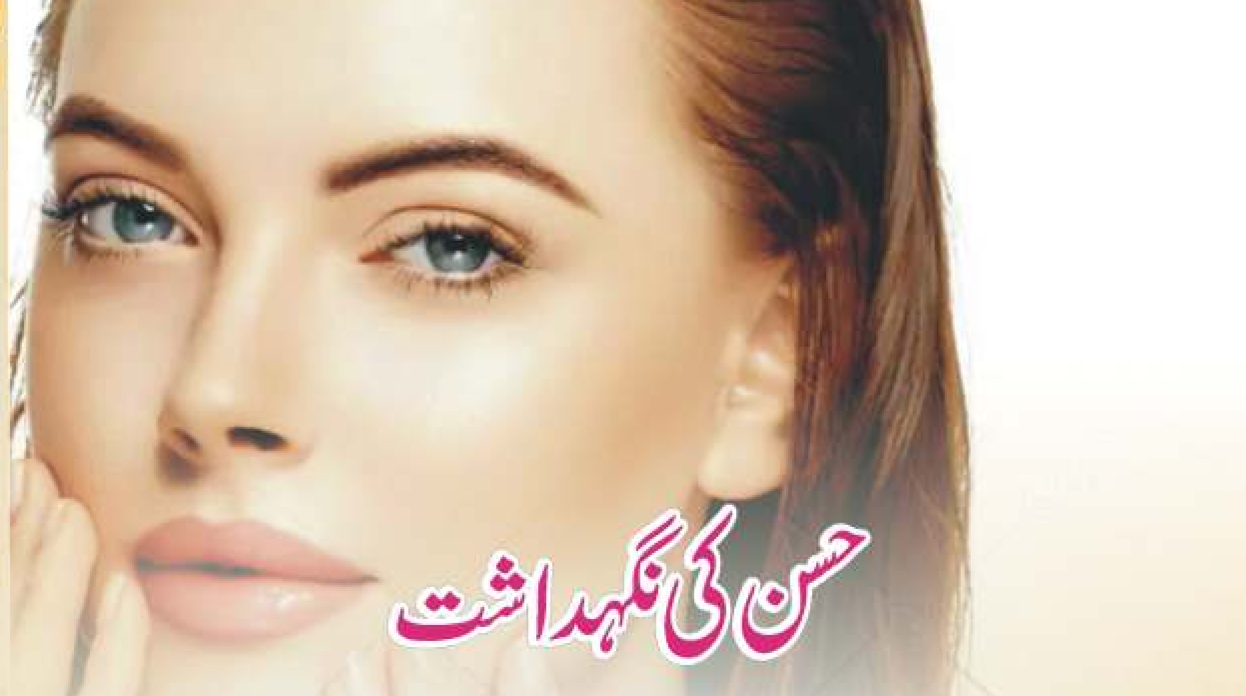

حسن کی نگہداشت

موسم گرما کے کچھ ٹپس

موسم گرما بھی موسم سرما کی طرح مختلف قسم کے بیوٹی ٹپس کا متقاضی ہوتا ہے، گرمیوں میں آپ کا آئی شیڈو پپوٹوں پر پگھل کر گریس بن جاتا ہے آپ کے بال خشک اور کھردرے ہو جاتے ہیں اور آپ کی رنگت آپ کی جلد کی رنگت کے مقابلے میں بہت خراب نظر آنے لگتی ہے اور آپ

پریشان ہو کر پارلر کا رخ کرتی ہیں۔ اس موسم میں اگر آپ بالوں کی کٹنگ کروا لیں تو بہت بہتر ہوگا کیونکہ گرمی میں سب سے زیادہ پریشانی لمبے بالوں کی ہوتی ہے اس حبس زدہ موسم میں بالوں میں چپ چپ شروع ہو جاتی ہے، اگر تیل لگایا جائے تو اس سے بھی بال خراب ہوتے ہیں اس لیے اس موسم میں بال چھوٹے ہی اچھے رہتے ہیں۔ اگر آپ میک اپ کے بغیر باہر نہیں نکلنا چاہتیں اور فاؤنڈیشن کے بغیر زندگی کو بے مقصد سمجھتی ہیں تو آپ اس سیزن میں فاؤنڈیشن کو بھول جائیں اور ٹن ٹیڈ موئسچرائزر کا استعمال کریں اگر آپ ایک بار اس کا استعمال کر لیں گی تو اس گرم موسم میں آپ فاؤنڈیشن کو بالکل بھول جائیں گی اور اسی موئسچرائزر کو ترجیح دیں گی کیونکہ یہ فاؤنڈیشن سے ہلکا ہوتا ہے مگر اس کے باوجود یہ جلد کی خامیوں کو چھپا دیتا ہے اور آپ کو ایسے نہیں لگتا کہ آپ نے چہرے پر کیک لگا رکھا ہے فاؤنڈیشن وقت گزرنے کے ساتھ پگھلنے لگتا ہے جبکہ موئسچرائزر کے ساتھ ایسا نہیں ہے اس میں ایس پی ایف کو بطور جز و استعمال کیا گیا ہے۔ اگر آپ اس موسم میں اپنے ناخنوں کی نمائش کرنا چاہتی ہیں تو ناخنوں پر برائٹ کلر لگائیں اس گرم موسم میں برائٹ پنک کلر بہت زبردست رہتا ہے اور یہ ناخنوں پر خوب جچتا ہے، خاص کر اگر جلد کی رنگت برعکس ہو تو اور بھی روشن نظر آئے گا۔

بلشر لگانا

اگر آپ بلش آن باقاعدگی سے لگائیں تو یہ آپ کے چہرے کو ایک ایسا خوبصورت تاثر دے گا کہ کوئی کاسمیٹکس یہ کام نہیں کر سکتی۔ بلش آن کو لگانے کے لیے یہ طریقہ استعمال کریں سب سے پہلے بلش آن کو گال سے کنپٹی کی طرف لے جائیں۔ اس کو آپ آنسو کی شکل میں لگائیں اور کنپٹی کے پاس بالوں کی لکیر سے دور رکھیں۔ پھر اس کو اسفنج، اس کے برش یا اپنی انگلیوں کی مدد سے بلینڈ کریں ایسا اس کی کوئی بیرونی لکیر نہ نظر آئے اور یہ آپ کی جلد کا ایک حصہ ہی لگے۔ اگر یہ صحیح جگہ لگا ہے تو یہ آپ کے چہرے کو

خود ایک مناسب شیپ دے گا۔ لیکن اس بات کو مدنظر رکھیں کہ آپ بذات خود اس چیز کو چہرے کی شیپ دینے کے لیے استعمال نہ کریں۔ اگر آپ کریم یا لیکوئیڈ کی شکل میں بلش آن لگائیں تو اس کے بعد فیس پاؤڈر ضرور لگائیں۔

ناخنوں کی دیکھ بھال

ناخن کے اردگرد تھوڑے سے نیم گرم تیل کی مالش کریں اور پھر اسے اچھی طرح صاف کرلیں تاکہ چکنائی کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہے۔ پھر ہائیڈروجن پرآکسائیڈ کے تین چمچ امونیا کے ایک چمچ میں ملائیں اور مکسچر کو روئی کے ٹکڑے سے انگلیوں اور ہاتھوں پر لگائیں۔ دو یا تین منٹ

کے بعد ہاتھوں کو دھو کر خشک کرلیں اور کوئی لوشن لگائیں۔ آپ ناخن کی پالش کی پہلی تہہ ناخنوں کی جڑ سے ناخنوں کی نوک تک لگائیں۔ جس وقت تک پالش گیلی ہو تو بلاٹنگ پیپر سے ناخنوں کے کناروں کو دور رکھیں تاکہ پالش دور ہو جائے اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو۔ ناخن پالش کو بالائی جلد سے تھوڑا سا ہٹا کر لگائیں تاکہ ہوا ناخنوں کی جڑ تک پہنچ سکے۔ جب پالش کی پہلی تہہ خشک ہو جائے تو دوسری تہہ اسی طرح سے لگائیں نارنجی رنگ کی اسٹک ریموور میں ڈبوئیں اور زیادہ لگ جانے والی پالش کو صاف کردیں اگر آپ کے ناخن زیادہ چوکور قسم کے ہیں تو ناخن کی پالش کو بیضوی شکل میں لائیں۔

بالوں میں ہیر کنڈیشنگ کا استعمال

صحت مند بال ہر عورت کی خواہش ہوتے ہیں اور ان کے حصول کے لیے وہ طرح طرح کے جتن کرتی نظر آتی ہیں۔ کچھ خواتین گھر پر طرح طرح کے گھریلو ٹوٹکے آزمانے لگتی ہیں تو کچھ بازار سے نت نئے مصنوعات خرید کر بالوں کا تختہ مشق بنا لیتی ہیں اور ان سب کوششوں کے پیچھے کارفرما محرک خوبصورت اور پرکشش بالوں کا حصول ہی ہوتا ہے، بال چکنے بھی ہوتے ہیں، خشک بھی ہوتے ہیں، سلکی بھی اور نارمل ہیر ٹائپ بھی۔ خشک بال کثرت سے دھونے کے بعد انتہائی کھردرے اور بے جان دکھائی دیتے ہیں۔ بالخصوص خشک موسم میں تو یہ اور بھی اڑے اڑے دکھائی دیتے ہیں اسی لیے انھیں بنانا بھی قدرے مشکل ہوتا ہے۔ ان کے برعکس صحت مند بال

انتہائی متوازن ہوتے ہیں ان کے چکنائی پیدا کرنے والے غدود مناسب مقدار میں چکنائی پیدا کرتے رہتے ہیں اور جو بالوں کو صحت مند رکھتے ہیں، بال نازک ہو جانے کی وجہ سے مختلف وجوہات کی بنا پر آسانی سے متاثر ہو جاتے ہیں اس لیے ان کی نگہداشت ایسے کنڈیشنر سے کرنی چاہیے جو بالوں کو بھرپور نرشنگ ٹریٹمنٹ دے سکے۔ بازاروں میں کئی غیر ملکی برانڈز کے امپورٹڈ ہیر کنڈیشنر بھی باآسانی دستیاب ہیں اور مقامی کمپنیوں کے تیار کردہ نسبتاً درجے سے لے کر عمدہ کوالٹی کے کنڈیشنر بھی دستیاب ہیں۔

(بحوالہ www.meriurdu.com)

تاثرات: نگر نگر سے

فروری 2020 کا شمارہ موصول ہوا۔ ہمیشہ کی طرح خوبصورت اور مختلف النوع اقسام کی تحریروں نے اس شمارہ کو مزید معلوماتی بنا دیا ہے۔ اداریہ میں لوک ادب کے حوالے سے گفتگو کی ہے جو کہ پُر مغز اور معلوماتی ہے۔ لوک گیتوں کی دنیا کی ہر بڑی زبانوں میں روایت رہی ہے۔ مگر افسوس اب اس کی اہمیت روز بہ روز کم ہوتی جا رہی ہے۔

یوں تو اس شمارے کے تمام مضامین اچھے ہیں۔ ڈاکٹر بی بی رضا خاتون کا مضمون 'جیلانی بانو کا سماجی و سیاسی شعور' (راستہ بند کے حوالے سے) خوب ہے۔ جیلانی بانو کا افسانوی مجموعہ 'راستہ بند ہے' کے حوالے سے ڈاکٹر بی بی رضا خاتون نے یہ مضمون قلمبند کیا ہے۔ میں اس پُر مغز اور معلوماتی مضمون کے لیے ان کو مبارک باد دیتا ہوں۔ کالم 'شاعرات کے منتخب اشعار' میں سکینہ ماجد پنہاں کے اشعار خوبصورت لگے۔ باقی شاعرات کے کلام بھی خوب ہیں۔ ساجدہ زیدی کا مضمون 'انسانی شخصیت' (ایک اساسی مضمون) اس سے قبل ان کی اپنی تصنیف 'شخصیت کے نظریات' میں پڑھ رکھی تھی۔ بہر حال یہ مضمون کافی اہم ہے۔ عشرت جہاں کا مضمون 'اردو کا داستانوی ادب ایک مطالعہ' داستانوی ادب کے حوالے سے معلوماتی ہے۔ زیب النساء کا مضمون 'راشد الخیری کا نظریہ تعلیم نسواں' بھی پسند آیا۔ فرح صاحبہ کا 'اکیسویں صدی کے اردو زبانوں کے نسوانی کردار' میں انھوں نے اہم اردو ناولوں میں نسوانی کردار کا جائزہ لیا ہے۔

گویا نسوانی کرداروں کے بغیر اردو ناول کا تصور محال ہے۔ اس مضمون کی روشنی میں بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک غیر معمولی نسوانی کردار کسی ناول کی روح ہوتی ہے۔ شرت چندر چٹرجی کا شمار اہم بنگالی ادیب میں ہوتا ہے۔ ان کا شاہکار ناول 'دیوداس' 1917 میں شائع ہوا تھا۔

اس ناول پر مرکوز رائحہ انصار کا مضمون 'دیوداس ایک مطالعہ' ہے۔ اس شاہکار ناول پر اب تک کئی فلمیں بھی بنی ہیں۔ جس سے اس ناول کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انصاری شاہین عبدالحکیم کی تحریر 'قیدی کا کمبل اور احمد فراز' مختصر مگر جامع ہے۔ کہانیوں میں شاہدہ شاہین کا 'ریچھ'، ڈاکٹر نسرین بیگم (علیگ) کا شگفتہ باجی اور ڈاکٹر ریشا قمر کا 'متاع زیست' پسند آئے۔ طلعت جہاں سروہا کی دونوں غزلیں اچھی ہیں۔ پہلی غزل کا پہلا ہی شعر دیکھیں

جو شخص تیرے غم میں بظاہر اداس ہے
وہ واقف سکوں ہے مسرت شناس ہے

یہ شعر حاصل کلام ہے۔ میں ان کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ صحت کے حوالے سے شکیل احمد صاحب کا مضمون 'معدنی عناصر اور پانی' ہماری غذا سے متعلق ہے جو اہم اور معلوماتی ہے۔ 'خواتین خبرنامہ' میں آسیہ لطیف کو ریاضی میں پی ایچ ڈی کی ڈگر تفویض کیے جانے کی خبر دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ خواتین کی تمام شعبہ ہائے زندگی میں نام روشن کر رہی ہیں۔

غرض فروری 2020 کا 'خواتین دنیا' اپنی تمام تر صفات کے باعث دل خوش کر گیا۔ میں اس شمارہ کی ترتیب و تزئین کے لیے مدیران کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر جاوید اختر، اسسٹنٹ ٹیچر (اردو)، گورنمنٹ پرائمری اسکول، دربھنگہ، بہار

'خواتین دنیا' کا فروری 2020 کا شمارہ ملا۔ ستر اسی کی دہائی میں خواتین مطالعے کی بے حد شوقین ہوا کرتی تھیں۔ شمع، روبی، شمع، بیسویں صدی جو آج بھی شائع ہو رہا ہے اور خاتون مشرق جیسے رسالوں کو بڑے شوق سے پڑھتی تھیں، لیکن آج انٹرنیٹ اور موبائل کے دور میں لوگ کتابوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں، خواتین کے لیے صرف گنتی کے رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ اداریہ 'مشعل' لوک گیتوں سے متعلق ہے جس میں لوک گیتوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، آپ نے لکھا ہے کہ "زبان میں ادب کی تخلیق کا آغاز لوک گیتوں کے ذریعے ہی ہوا ہے" یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ اداریے کا موضوع منفرد نوعیت کا ہے جو متاثر کرتا ہے۔ عشرت جہاں کا مضمون 'اردو کا داستانوی ادب' پسند آیا۔ مختصر مضمون میں سبھی پہلوؤں کو سمیٹ لیا ہے۔ افسانے پڑھنے کی میں بہت شوقین ہوں۔ شاہدہ شاہین کی کہانی 'ریچھ' میں عورت کے ساتھ ہونے والی ہولناکیوں کو پیش کیا ہے۔ کہانی کا آغاز جنگل سے ہوتا ہے۔ ہمیشہ اس کی دادی ماں اسے سمجھاتیں کہ جنگل کبھی مت جانا وہاں ریچھ رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ شریفہ آنٹی اس کے گھر آتی ہیں اور ان کا لڑکا اس کی ساری چیزیں پھینک کر اس کے ساتھ بدتمیزی کرتا ہے۔ لڑکا چھوٹا ہے کہہ کر اس کی غلطیاں نظر انداز کر دی جاتی ہیں، لیکن ایک دن جب وہ کالج سے واپس آ رہی ہوتی ہے تو کچھ لڑکے اسے اٹھا کر لے جاتے ہیں اور اس کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ کہانی میں یہ پیغام دیا گیا ہے کہ ایک ماں کو ہمیشہ اپنے لڑکے کو قابو میں رکھنا چاہیے، غلطیوں پر سمجھانا چاہیے نہیں تو آگے چل کر بہت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہمیشہ عورت کا کردار کمتر بنا کر ہی کیوں پیش کیا جاتا ہے؟ کیا عورتیں صرف بے بس ہی ہوتی ہیں جو ہمیشہ تسلی کی محتاج رہتی ہوں..؟ بالکل نہیں!.. عورت تو وہ ہے جس نے بہترین معاشرے کی بنیاد ڈالی، اگر ہم چاہیں تو اسے لاچار دکھانے کے بجائے بلند کردار بھی دکھا سکتے ہیں۔ ریشما قمر کا افسانہ بھی خوب ہے۔ اس کے علاوہ خواتین خبرنامہ، حسن کی نگہداشت اور لذیذ پکوان جیسے کالم اور دیدہ زیب تصویریں رسالے کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں۔

استوتی اگروال، اگروال جیولرز، سرونج، ایم پی

مارچ کا شمارہ موصول ہوا۔ اس شمارے میں جو مضمون مجھے بے حد پسند آیا وہ خواتین کو با اختیار بنانے کے اہداف اور حقیقت ہے۔ اس مضمون میں مضمون نگار نے بہت محنت کی ہے مضمون کی قرات سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ دیگر مشمولات بھی قابل توجہ ہیں۔ خواتین کے مختلف اور اہم گوشے بھی ہماری توجہ اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہیں۔ صحت سے متعلق مضمون بھی کافی پسند آیا۔ مختصر یہ کہ شمارہ بھی اپنے منفرد انداز کا ہے اور قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہے۔

فائزہ صدیقی، میوات

مارچ کا شمارہ ملا۔ پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ روبرو میں رفیعہ شبنم عابدی کا انٹرویو شامل ہے۔ شخصیت کے ذیل میں نور جہاں ثروت پر معلوماتی مضمون ہے۔ جہان نسواں کے تحت تمام مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کہانیاں بھی لاجواب ہیں۔ خصوصی طور پر شہانہ خاتون کی کہانی، زندگی خود ہی گناہوں کی سزا دیتی ہے' بہت پسند آئی۔ نازیہ پروین کی غزل بھی اچھی ہے۔ لذیذ پکوان کی تمام ڈشیز گھر پر بنائی جا سکتی ہیں۔ کھانا پکانے سے متعلق ضروری باتوں کا ہم سب کو خیال رکھنا چاہیے۔ خواتین حسن سے متعلق آرائش و زیبائش بھی اچھی لگی۔ تاثرات اور خواتین خبرنامہ بھی دلچسپ اور معلومات سے بھرپور ہے۔ امید ہے یہ رسالہ اسی طرح اپنی آب و تاب قائم رکھے گا۔

رعنا تبسم، کولکاتہ

'خواتین دنیا' کی میں بہت پرستار ہوں اور آغاز سے ہی یہ میرے مطالعے میں ہے۔ اس رسالے کی کامیابی کونسل کے عملہ کے سر جاتی ہے جس کی بے شمار محنت اس کو سجانے سنوارنے میں اہم رول ادا کرتی ہے اور اس کی کامیابی کی ضامن بھی ہے۔

مارچ کے شمارے میں زیادہ تر مضامین خواتین نے لکھے ہیں اس رسالے کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں خواتین سے متعلق بہت مواد موجود ہوتا ہے۔ رسالے کے موضوعات میں تنوع بھی دکھائی دیتا ہے۔

عائشہ خانم، بھیونڈی، مہاراشٹر

'ماہنامہ خواتین دنیا' میرے مطالعہ میں پابندی سے رہا ہے۔ تمام مضامین ترتیب اور سلیقے سے لکھے گئے ہیں۔ اداریہ سے لے کر خبرنامہ تک تمام مواد معیاری اور معلوماتی ہے۔ تاثرات بھی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ 'خواتین دنیا' ہر زاویہ سے قابل تحسین ہے اس رسالے میں متنوع موضوعات پر مضامین موجود ہوتے ہیں جو ادبی بصیرت لیے ہوئے ہوتے ہیں۔

شاذیہ، امروہہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

فسانہ عجائب

مصنف: رجب علی بیگ سرور

صفحات: 91

قیمت: 25 روپے

کیفیہ

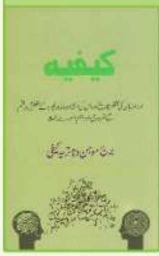

مصنف: برج موہن دتاتریہ کیفی

صفحات: 294

قیمت: 140 روپے

اربابِ نثر اردو

مصنف: سید محمد

صفحات: 247

قیمت: 135 روپے

تاریخ تحریکِ آزادیِ ہند

مصنف: تاراچند

صفحات: 736

قیمت: 310 روپے

معاصر تنقیدی رویے

مصنف: ابوالکلام قاسمی

صفحات: 279

قیمت: 125 روپے

تفہیمات وترجیحات

مصنف: شیخ عقیل احمد

صفحات: 237

قیمت: 130 روپے

خودنوشت سوانح عمری: شیخ علی حزیں لاہجیؒ

ترجمہ وتقدیم: ڈاکٹر محمد ارشاد ندوی نوگانوی

صفحات: 136

قیمت: 85 روپے

مشاہیر ادبیات مشرقی

مصنف: پروفیسر محسن عثمانی ندوی

صفحات: 292

قیمت: 145 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly May 2020, Vol. 4, Issue: 5 **RNI. No. DELURD/2017/74026**
National Council for Promotion of Urdu Language **ISSN 2581-4826**
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025